رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۶ عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۳ پیسے

مسئلہ قربانی

عقلی اور شرعی نقطۂ نظر سے

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

آف سیٹ کی دیدہ زیب طباعت

قیمت : قسم اعلیٰ رنگین سر ورق : آٹھ آنے

" " " بتیس روپے سینکڑہ

قیمت : سستا ایڈیشن (طباعت آف سیٹ) : چار آنے

" " " پندرہ روپے سینکڑہ

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	مئی سنہ ۱۹۶۱ء	جلد ۵۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حکیم الامت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف الفوز الکبیر میں اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ قرآن مجید میں جو مختلف قوموں کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن کی حیثیت زیبِ داستاں کی نہیں بلکہ عبرت کی ہے تاکہ آنے والی قومیں گزری قوموں کے افکار و اعمال کو دیکھ کر اُن راستوں کو پہچان سکیں جو قوموں کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ شاہ صاحب نے قرآن حکیم کے اسی پہلو کو التذکیر بایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جب اس میں کسی خاص قوم کے حالات کا ذکر کیا جا رہا ہو تو اگرچہ زیر بحث ایک مخصوص قوم ہی ہوتی ہے مگر قرآن کا خطاب دنیا کی ساری اقوام سے ہوتا ہے بلکہ بمصداق حدیث "لتتبعن سنن من قبلکم" زمانہ نبوی میں کوئی بلا ایسی نہ تھی جس کا نمونہ آج موجود نہ ہو۔ اس لیے ان حکایات سے مقصود اُن مقاصد کے لیے کلیات کا بیان ہے نہ کہ ان حکایات کی خصوصیات۔"

شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ کوئی اچنبھا نہیں بلکہ فطرت کے ایک عام اور بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر نئی آنے والی حالت اور گزری ہوئی حالتوں کے درمیان کوئی مماثلت اور یکسانیت نہیں اور ہر نئے

دَور یا ہر نئی حالت اور گزشتہ ادوار و احوال میں ایک نوعی فرق و اختلاف ہے تو پھر اجتماعی اور انفرادی تجربات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی کیونکہ اس صورت میں تجربہ تمام ان حالات و واقعات سے ماخوذ قرار پائے گا جو نئے حالات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو نہ صرف انسانی تجربات بالکل بیکار ہو جاتے ہیں بلکہ خود تاریخ بھی گزشتہ حالات و واقعات کا ایک بے معنی مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے اور گزشتہ حالات و واقعات سے یا تاریخ سے کسی انسان کے لیے سبق حاصل کرنا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ماضی سے درسِ عبرت صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کریں کہ زمانہ گزشتہ اور زمانہ حال میں کوئی بنیادی فرق یا تضاد نہیں۔ ہم جو ماضی کی داستانوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں یا گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو ان کی تہ میں یہی اساسی تصور کارفرما ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہمیں آج جو محرکات۔ جنگ و صلح، دوستی و دشمنی اور تعمیر و تخریب پر ابھارتے ہیں وہ ان محرکات سے کسی طرح مختلف نہیں جو ازمنۂ گزشتہ کے انسانوں کو مذکورۂ بالا اعمال پر ابھارتے تھے۔ زمانہ اور حالات کے تغیر و تبدل کی بنا پر انسان اور انسان کے درمیان کسی نوعی فرق کو تسلیم کرنا نوعِ انسانی کی پوری تاریخ کی تکذیب کرنا ہے یا دوسرے لفظوں میں انسانی تجربات کی قدر و قیمت کا سرے سے انکار ہے۔

ماضی اور حال کے درمیان حقیقی تعلق اسی صورت میں استوار کیا جا سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے ورنہ اگر ماضی کے واقعات بنیادی اور اساسی طور پر حال کے واقعات سے مختلف ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کا مطالعہ ہمارے لیے یکسر عبث اور بیکار ہے اور اس کی حیثیت طلسم ہوشربا سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ ماضی اور حال کے درمیان تعلق کی جو مختلف کڑیاں قائم کی جاتی ہیں وہ صرف اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں کہ جس طرح آج کی آگ میں اور ماضی کی آگ میں جلانے کی صلاحیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں بالکل اسی طرح ماضی کے انسان

اور آج کے انسان کے مابین جذبات و احساسات کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں۔

ماضی اور حال کے درمیان اسی تعلق کی وجہ سے شریعتِ اسلامی میں قیاس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر ماضی اور حال کے واقعات میں بنیادی اور اساسی فرق ہوتا تو کسی خاص عہد کے ایک واقعہ سے دوسرے عہد کے اسی نوعیت کے واقعہ پر استدلال نہ کیا جا سکتا لیکن آج شریعتِ اسلامی میں قیاس کی مدد سے جو مختلف الجنس حل کی گئیں اور جس طرح ماضی کے واقعات سے استنباط کر کے حال کے مسائل کو سلجھایا گیا وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ تاریخ میں حالات و واقعات کا ایک ایسا تکرار دکھائی دیتا ہے جس سے بڑی آسانی کے ساتھ اُن حالات و واقعات کے متعلق چند بنیادی اصول و ضوابط مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ منطق کی اصطلاح میں اسی نوع کی کوششوں کو قیاس العلۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حافظ ابنِ قیّم نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف اعلام الموقعین کی جلد اوّل میں اس موضوع پر بحث کی ہے[۱]۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ	تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں
فَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ	چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ، هٰذَا بَيَانٌ	(اللہ کے احکام و ہدایت) کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے
لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ	لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے
(آل عمران: ۱۳۷-۱۳۸)	ڈرتے ہیں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

اس آیت میں قرآن مجید لوگوں کو زمین میں چل پھر کر دیدۂ عبرت سے گزشتہ اقوام کے حسرتناک انجام کو دیکھنے کی جو دعوت دیتا ہے تو اس کی تہ میں یہی بنیادی تصوّر کارفرما ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے سے جس طرح ماضی کی قومیں تباہ و برباد ہوئیں بالکل اسی طرح

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے اعلام الموقعین جلد اول صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۸

تم بھی انہی کی روش پر چل کر انجامِ بد کو پہنچو گے۔ جب تمہارے درمیان علت یعنی "تکذیبِ رسل" ایک ہے۔ اُس کے نتائج بھی یکساں ہونے چاہییں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ گزری ہوئی قوموں کو احکامِ خداوندی پس پشت ڈالنے کی وجہ سے ہلاک کر دے اور تمہیں اس غلط روش کی وجہ سے دنیا میں سربلندی عطا کرے۔ علت کی یکسانیت کی وجہ سے نتائج بھی ایک ہی نوعیت کے برآمد ہوتے ہیں۔

اسی حقیقت کو قرآن مجید ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔

(الانعام ۶)

کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے۔ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا تھا۔ ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا) تو آخر کار ہم نے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور اُن کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا۔

حافظ ابن قیم اس آیت کی تصریح میں فرماتے ہیں کہ گزشتہ اقوام کی ہلاکت و بربادی کی اصل وجہ اُن کی بداعمالیاں اور راہِ حق سے انحراف تھا اور یہی وہ ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر انہیں دنیا سے نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ پھر جس طرح انہیں اُن کی قوت و طاقت عذابِ الٰہی سے قطعاً محفوظ نہ رکھ سکی اور اُن کی شوکت و ثروت اُن کے کسی کام نہ آئی بالکل اسی طرح تمہیں بھی یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مال و دولت کی فراوانی، یہ خسروانہ جلال، اور یہ غیر مسئول اقتدار تمہیں خدا کی گرفت سے بالکل بچا نہیں سکتا۔ یہ سب چیزیں جنہیں آج تم اپنی زندگی کے بہت بڑے سہارے

سمجھتے ہو وقت آنے پر تمہارے لیے سانپ اور بچھو سے زیادہ خطرناک ثابت ہوں گی۔

اسی حقیقت کو پھر سورۂ توبہ میں دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا:

كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۔

(التوبہ: ۶۹-۷۰)

تم لوگوں کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش رؤوں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال و اولاد والے تھے پھر انہوں نے دنیا میں اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے۔ سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی اب خسارے میں ہیں۔ کیا ان لوگوں کو اپنے پیش رؤوں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ مال و اولاد کی کثرت اور قوت و طاقت کی فراوانی قانونِ الٰہی کو بدل نہیں سکتی۔ وہ قادرِ مطلق جس نے ماضی میں بڑی بڑی طاقتور قوموں کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تھا وہ تمہیں بھی تمہارے تباہ دہ مال کے باوجود گناہوں کی سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

تمہارے ان معاشی منصوبوں کے چرچے، تمہاری اس سیادت اور قیادت کے غلغلے، تمہاری یہ انجمن سازیاں اور جتھہ بندیاں، الغرض تمہاری یہ ساری نعرہ بازیاں اور کمزوروں کو مرعوب بلکہ خوفزدہ کرنے کے مختلف ہتھکنڈے تمہیں خدا کی گرفت سے کسی طرح بچا نہیں سکتے۔ اُس کی پکڑ بڑی مضبوط ہے اور جب وہ ذات کسی پر اپنا ہاتھ ڈال دیتی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُس سے نجات نہیں دلوا سکتی۔ تم بلند بانگ دعوے کر کے ممکن ہے کچھ مدت تک اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکو مگر جس دن اُس خالقِ کائنات نے تمہارا احتساب شروع کیا تو پھر تمہارے لیے کوئی جائے قرار نہ ہو گی۔ اُس دن سانپوں، بچھوؤں، شیروں اور چیتوں تک کو تو ممکن ہے سر چھپانے کے لیے جگہ میسر آ جائے مگر تمہیں اس کرۂ ارضی کا کوئی کونہ پناہ دینے کے لیے تیار نہ ہو گا اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو جائے گی۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ تم سے پہلے ہزاروں طاقتور گروہ اس دھرتی کے سینے پر اُبھرے۔ انہوں نے قوت و طاقت کو غلام بنایا اور پھر پوری دنیا پر چھا گئے مگر کچھ مدّت کے بعد ہی جب انہوں نے خداوند تعالیٰ سے روگردانی کی تو وہ دنیا سے اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ آج اُن کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ تاریخ کے یہی اوراق جن سے ان کی حیات کی داستانیں مزیّن تھیں پھر اُن کے مدفن بنے۔ اس بنا پر یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں کہ تم ایک عارضی اور ناپائیدار قوت و طاقت حاصل ہونے کے بعد اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھو اور اس کے غرّہ میں آ کر ایسی حرکات و سکنات شروع کر دو جو تمہیں سربلندی کی طرف لے جانے والی نہیں بلکہ دنیا اور آخرت میں ذلیل و خوار کرنے والی ہیں۔ مسندِ اقتدار جسے تم نے ہمیشہ اور مستقل رہنے والی چیز سمجھ کر اُس پر تکیہ کیا ہوا ہے۔ اُس نے آج تک کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ بیتِ عنکبوت بھی اس کے مقابلے میں زیادہ پائیدار اور دیرپا ہے۔ اس بنا پر تم بڑے درجے کے احمق ہو گے اگر اس کے طلسم میں گرفتار ہو کر اپنی بربادی کے خود اپنے ہاتھوں سے تجربے کرنے لگو۔ تمہارے سامنے گزشتہ اقوام کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں تمہیں اُن کا عبرت کی نگاہ سے مطالعہ کرنا چاہیے

اوران سے سبق حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ جب تمہارا انداز زیست اُن تباہ شدہ قوموں کے انداز سے ملتا جلتا ہے تو تم بھی لازمی طور پر انہی بربادیوں سے دوچار ہو گے جن سے وہ دوچار ہوتی تھیں۔ جب تمہاری منزل وہی ہے جو ان کی تھی اور تمہارے قدم بھی اسی سمت کی طرف اٹھ رہے ہیں جس سمت اُن کے اٹھتے رہے ہیں تو تمہارا انجام آخرکار وہی ہوگا جو ان کا ہوا تھا تمہیں اس مآل کار سے دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

قرآن مجید پھر بعض دوسرے مقامات پر اُن اسباب کی بھی نشاندہی کرتا ہے جن کی وجہ سے دنیا کی طاقتور قومیں ماضی کے حالات وواقعات سے عبرت نہیں پکڑتیں۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج: ۴۶)

غرض کتنی بستیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک کیا، سو اب اُن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں (اور اسی طرح ان بستیوں میں) کتنے کنوئیں بیکار اور کتنے مضبوط محلات ویران پڑے ہیں کیا ان لوگوں نے ان بستیوں میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا تاکہ ان کے دل غور و فکر کے لیے بیدار ہوں یا ان کے کانوں میں سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھوں کی بصارت زائل نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں قرآن حکیم سب سے پہلی کمزوری جس سے انسانوں کو روشناس کراتا ہے وہ بصیرت کا فقدان ہے۔ وہ لوگ جو آنکھوں کے باوجود عبرت انگیز واقعات سے عبرت حاصل نہیں کرتے اُن کی دل کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں وہ دیکھتے تو ہیں مگر دیدۂ عبرت سے

نہیں دیکھتے اور دنیا کے فکر انگیز حالات اُن کے اندر غور و خوض کی کوئی تحریک نہیں کرتے اُن کے قلوب احساسات و جذبات کے مخزن نہیں رہتے جن کے تاروں میں ارتعاش پیدا کیا جا سکے بلکہ وہ محض پتھر کے ٹکڑے بن جاتے ہیں جنہیں بڑے سے بڑے حادثات بھی متاثر کرنے میں یکسر ناکام ہوتے ہیں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (البقرہ: ۷۴)

(بدعملیوں اور شقاوتوں کی وجہ سے) تمہارے دل سخت ہو گئے ہیں ایسے سخت گویا پتھر کی چٹانیں ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

فکر و نظر کے اس عارضے سے پھر اُن کے اندر مختلف قسم کی ذہنی اور اخلاقی بیماریاں پرورش پانے لگتی ہیں جن میں غالباً سب سے خطرناک بیماری اُن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی سے اُن کے فکر و نظر کے زاویے یکسر متغیر ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کے خیر و شر کے پیمانوں میں بھی بہت نمایاں تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ وہ شخص جس کی نگاہ کے مراکز اپنے اصل مقام سے ہٹ چکے ہوں جس طرح وہ مختلف اشیاء اور مناظر کو ہمیشہ غلط زاویوں سے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے اور ان کے حسن و جمال کا صحیح صحیح اندازہ لگانے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے بالکل اسی طرح نگاہ کے اس ٹیڑھ کی وجہ اُس کے خوب و ناخوب کے معیار بھی یکسر بدل جاتے ہیں جن افکار و اعمال کو خداوند تعالیٰ نے نوع بشری کے لیے مضرت رساں قرار دیا ہے وہ اس کی نظروں کو مفتوح کر لیتے ہیں اور وہ انسانیت کی فلاح و بقا انہیں میں دیکھنے لگتا ہے اور ان کے برعکس جن چیزوں کو اللہ نے پسند فرمایا ہے اور انہیں اپنانے کا حکم دیا ہے وہ اس کی نظروں میں ناپسندیدہ ٹھہرتی ہیں اور وہ ان سے ہر گام پر بچنے کی سعی کرتا ہے۔ "خوب و ناخوب" کی اس تبدیلی سے خیر و شر کے سارے معیارات بدل کر رہ جاتے ہیں اور افراد اور قومیں ایک عجیب و غریب مخمصے

میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔ (العنکبوت۔ ۳۸)

اور ہم نے عاد اور ثمود کو بھی (ان کے عناد کی وجہ سے) ہلاک کیا اور اُن کی یہ ہلاکت انگیزی تمہیں اُن کی رہائش گاہوں سے صاف نظر آرہی ہے (اور وہ اس انجام بد، کو اس بنا پر پہنچے کہ) شیطان نے اُن کے (بُرے) اعمال کو اُن کی نظروں میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس طریق سے انہیں) راہِ حق سے روک دیا تھا حالانکہ وہ اپنے نزدیک عقلمند تھے

دنیا میں کسی فرد یا قوم کے لیے اس سے زیادہ آزمائش اور کون سی ہو سکتی ہے کہ اس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو ہی بالکل الٹ کر رکھ دیا جائے اور اس طرح ذم مدح میں، معائب محاسن میں اور مثالب مناقب میں اُس کے سامنے جلوہ گر ہونے لگیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ پھر یہ تبدیلی بھی متناسب اور متوازن نہیں ہوتی بلکہ انسان کے قلب و دماغ کے اندر ایک ایسا انتشار رونما ہوتا ہے جو اُس کی زندگی کے سارے شعبوں کو تنزلزل کر دیتا ہے اور اس کی حیات مستعار کے پورے لمحات ایک قسم کے ذہنی اور اخلاقی بحران میں گزرتے ہیں۔ اس کی ذات سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اُس کی ساری صلاحیتیں اور قلب و دماغ کی پوری قوتیں تخریبی کارروائیوں میں صرف ہوتی رہتی ہیں۔

اس منتشر قلب و دماغ کے اندر چونکہ وہ اخلاقی جرأت ختم ہو جاتی ہے جو کسی فرد یا قوم کو اعتراف حقیقت پر ابھارتی ہے اس لیے وہ اپنی بد اعمالیوں کو برحق ثابت

کرنے کے لیے نوعِ انسانی کے اندر ایک مصنوعی برتری کی نمائش شروع کر دیتا ہے۔ اعترافِ گناہ درحقیقت ایک نہایت ہی اونچا وصف ہے اور اس کی وہ شخص جرأت کر سکتا ہے جو ذہنی اور قلبی اعتبار سے بالکل تندرست اور توانا ہو۔ ایک بیمار دل کے اندر اتنی طاقت ہی نہیں رہتی کہ وہ اتنا عظیم کام سرانجام دے سکے۔ اس لیے وہ لوگ جو ذہنی اور قلبی عارضوں کا شکار ہوتے ہیں وہ حق و صداقت کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے استکبار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کچھ مدت تک اس دھوکہ میں مبتلا رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ حق کی راہ پر گامزن ہیں کسی میں یہ دم خم نہیں کہ وہ انہیں اُن کی کسی غلط حرکت پر ٹوک سکے۔ چونکہ حق کی منزل ایک کٹھن منزل ہے اس لیے وہ ہمیشہ اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اُسے ہی لوگ حق سمجھ کر اس کی بلاچون و چرا پیروی کرنے لگیں تاکہ کچھ عرصہ کے لیے اُن کے جذبۂ نخوت کی تسکین ہوتی رہے اور حقائق کی تلخیاں اُن کے قوت و طاقت کے نشے کو اتار نہ دیں۔

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ ۔ (العنکبوت: ۳۹)

اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور ان (دشمنوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق) لیکر آئے تھے پھر ان لوگوں نے زمین میں استکبار کی روش اختیار کی، مگر وہ ہمارے مقابلے میں جیت نہ سکے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح الفاظ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ قارون، فرعون اور ہامان کو قبولِ حق سے جس چیز نے منع کیا وہ استکبار تھا۔ ان بدنصیب لوگوں کا مغرورانہ احساس اُن کے جذبات و احساسات کے ساتھ مسلسل کھیلتا رہا اور انہیں حق کی طرف بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ حق کا تسلیم کرنا دراصل اعترافِ حقیقت ہے اور یہ گمراہ لوگ اپنے اندر ہمت نہیں پاتے کہ اس کی طرف خالی الذہن ہو کر توجہ دے سکیں

وہ ہمیشہ اسی آرزو میں ہمت آزما رہتے ہیں کہ باطل افکار و نظریات کے جو شیش محل انہوں نے تیار کر رکھے ہیں انہیں کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچنے پائے اور غلط خواہشات کے جو جالے انہوں نے اپنے اردگرد تنے ہوتے ہیں کوئی انہیں چھونے کی ہمت نہ کرے۔ وہ اپنی زندگیاں انہی بدمستیوں میں بسر کرتے رہیں اور کوئی ان سے یہ نہ کہے کہ حضور آپ غلط راہوں پر بھاگے جا رہے ہیں۔

آپ اگر "استکبار" کے اجزائے ترکیبی پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا خمیر خود فریبی سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کے مظاہر بلاشبہ کئی ایک ہوتے ہیں مگر اس کا اصل محرک صرف خود فریبی ہی ہے۔ ایک شخص جب حقیقت کا مقابلہ کرنے کی اپنے آپ میں ہمت اور طاقت نہیں پاتا تو پھر وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے اس مصنوعی طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے۔ یہ روش دراصل حق کے مقابلے میں ایک شکست خوردہ احساس کی بدیہی علامت ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اُس کے اندر حقائق کا سامنا کرنے کی کوئی طاقت اور ہمت نہیں۔ چنانچہ جدید نفسیات کے ماہرین نے بڑے واضح دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ قوت و طاقت کے حصول کے لیے اور پھر اس کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے دنیا کے برسرِ اقتدار طبقے جو مختلف قسم کے نمائشی کام کرتے ہیں اُن کی تہ میں یہی احساسِ شکست کارفرما ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے اندر حقیقی عظمت کے کسی جوہر کی پرورش نہیں کر پاتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ابنائے نوع پر تفوق اور برتری جتلانے کے بھی آرزومند ہوتے ہیں اس لیے وہ اس خلا کو مختلف قسم کے نمائشی کام کر کے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مال و متاع پر فخر و غرور، یہ جاہ و جلال کے تذکرے، یہ قوت و طاقت کے غلغلے اور ہر اختلاف کرنے والے کو تحدی یہ سب اسی احساسِ شکست کے مختلف شاخسانے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ حق سے اعراض کرنے والے اور اس کا راستہ روکنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ایک طرف تو اسی نوعیت کی شکست خوردہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنی سوسائٹی میں اپنے آپ کو مقتدر ہستیاں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ مختلف مقامات پر قرآنِ حکیم نے جو اُن کے تذکرے کیے ہیں اُن سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو اطاعتِ خداوندی کی دعوت دی اور اسے عذاب الٰہی سے ڈرایا تو اس قوم کے برسرِ اقتدار لوگوں نے اس دعوت کے جواب میں جو بات کہی وہ اس جذبۂ نخوت کی نہایت کھلی غمازی کرتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ۔ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ۔ (ہود-۳)	(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا" جواب میں اس کی قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ کمین اور رذیل تھے ان کے سوا کسی نے بھی تمہاری پیروی نہیں کی اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس سے تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

"قوم کے ان سرداروں کا یہ جواب دراصل کسی مخصوص عہد یا مخصوص ماحول یا مخصوص اشخاص سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اُس عام روش کا اظہار ہے جو برسرِ اقتدار گروہ حق کے مقابلے میں اختیار کرتا ہے۔ انہیں حق کے قبول کرنے میں جو چیز مانع ہو رہی تھی وہ یہی تھی کہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینے کے بعد ان کی اپنی خدائی کا قصر پیوندِ خاک ہو جائیگا۔ پھر اُن کی قوم کے اندر اُن کی کبریائی کا وہ سکّہ نہ چل سکے گا جو برسوں سے چلتا چلا آ رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے معاشرے میں ناکارہ ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مفسرین نے اَلْمَلَاُ کی جو تعریف کی ہے اسی سے اُن کے اندازِ فکر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل و دماغ میں حبِّ جاہ، شہرت کی ہوس اور سیادت و قیادت کی انتہائی خواہش اور خود غرضی موجود ہو۔ یہ لوگ حق و صداقت کے کچھ اس وجہ سے دشمن نہ تھے کہ اسے وہ اپنی قوم اور ملت کے لیے مضرت رساں اور نقصان دہ خیال کرتے۔ اُن کی دشمنی کا سارا دار و مدار صرف اس بات پر تھا کہ اسے قبول کر لینے کے بعد پھر اُن کے جذبۂ نخوت کی تسکین نہ ہو سکے گی۔ معاشرے میں جو بلند و بالا مقام انہیں حاصل ہے اور جس غیر مسئول اقتدار کے وہ رسیا ہیں اُسے پھر وہ قائم نہ رکھ سکیں گے۔ حق کے سامنے سرنگوں ہو جانے کے بعد وہ انسانوں میں محض ایک انسان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے اور اپنی کبریائی اور خدائی کے جو ٹھاٹھ انہوں نے قائم کر رکھے ہیں پھر ان کی حفاظت و پاسبانی نہ ہو سکے گی۔ سوسائٹی کے مختلف طبقات میں انہوں نے تفوق کی جو غلط فضا قائم کر رکھی ہے اُس کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اس کی تصریح حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے یوں فرمائی گئی ہے۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا	اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی
قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ	شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے برادرانِ قوم!

غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ . . . . قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۔ (الاعراف: ۸۵ و ۸۸)

اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے لہذا وزن اور پیمانے پورے کرو۔ لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ . . . اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اُس سے کہا کہ اے شعیبؑ ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

یہ آیات غلط کار قیادت کے انداز فکر کی نہایت واضح الفاظ میں ترجمانی کرتی ہیں۔ مدین والوں کو جب خدا خوفی، پرہیزگاری اور باہمی لین دین میں دیانت داری کا مسلک اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تو اس دعوت سے اُس قوم کے برسرِ اقتدار حلقوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور وہ اس بات پر سخت برہم ہوئے کہ کوئی شخص اُن کے اندازِ فکر اور اندازِ زیست میں ایسی تبدیلی کرنے کا ارادہ کر رہا ہے جس سے ان کی قیادت اور سیادت کے قصر میں شگاف پڑنے کا خطرہ تھا۔ اُن کے دماغ کا مغرورانہ احساس کسی ایسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا جو انہیں حق پرستی کی دعوت دے اور اُن سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ وہ حرام طریقوں سے مال و دولت کمانے کا وطیرہ ترک کر دیں۔ حق کی دعوت کو قبول کرنا تو درکنار وہ اس بات کو بھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنے معاشرہ میں زندہ رہنے کا موقع دیں جو خلقِ خدا کو نیکی اور پاکبازی کی

دعوت دے اور ان سے کہے کہ تم ان جھوٹے خداؤں کی پرستش چھوڑ کر اُس خالق کی پرستش اختیار کرو جو تمہارا مالک اور قانون ساز ہے۔

جھوٹی خدائی کے ان دعوےداروں کی ذہنیتیں اس قدر بگڑ چکی تھیں کہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ہر کام کو ہدفِ استہزاء بناتے اور خدا کا اگر کوئی صالح اور پاکباز بندہ انہیں ان کی ان بُری حرکات پر ٹوکتا تو وہ اس کی اس پاکبازانہ زندگی پر پھبتی کس کر اس کی شخصیت کا استخفاف کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کے نیک بندوں کی تضحیک کر دینے سے وہ انہیں اور اُن کے مقدس کارناموں کو لوگوں کی نظروں میں بے وزن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر یہ محض ان کا فریب نظر تھا۔ وہ یہ ساری نازیبا حرکات احساس کہتری میں مبتلا ہو کر کر رہے تھے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دلائل ان کا ساتھ نہیں دے رہے، حق اور انصاف اُن کے مخالف ہے اور خود اُن کے اپنے ضمیر میں اتنی سکت نہیں کہ وہ ان کی بدعمالیوں کی بغیر کسی خلش کے تائید کر سکے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے اُن کی دعوت کے جواب میں جو الفاظ کہے وہ اسی ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں:

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ (الاعراف: ۸۰-۸۲)

اور لوط نے جب اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گذر جانے والے لوگ ہو، مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ نکالو ان لوگوں کو بستی سے، بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔

جمہوریت کی کہانی

از جناب نعیم صدیقی

[برادرم مکرمی جناب نعیم صدیقی صاحب نے یہ قابلِ قدر مقالہ چند ماہ قبل لکھنا شروع کیا مگر آگے چل کر جب بحث و تحقیق کا میدان پھیلتا نظر آیا تو انہوں نے اس کام کو ایک نئے اور جامع نقشے سے کرنے کا خاکہ بنایا۔ میں نے جب اس مضمون کو اُن سے لے کر مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بعض بڑے مفید مباحث موجود ہیں۔ اگرچہ انہیں اصرار یہی تھا کہ اسے اس موجودہ صورت میں شائع نہ کیا جاتے مگر اس کی افادیت کے پیش نظر اسے موجودہ صورت ہی میں اشاعت کے لیے دیا جا رہا ہے۔ مضمون کی باقی اقساط انشاء اللہ مجوزہ نقشہ کے مطابق ہی تیار ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی ــــ ع - ح - ص]

جمہوریت! ــــ اسلامی جمہوریت، مغربی جمہوریت، پارلیمانی اور صدارتی جمہوریت، مضبوط اور قابلِ فہم جمہوریت ــــ ہماری گفتگوؤں، تحریروں اور تقریروں کا ایک اہم موضوع رہی ہے۔ مگر اس موضوع پر اردو زبان میں ہم نے بہت کم سرمایۂ فکر و تحقیق جمع کیا ہے۔ اسی احساس کے تحت اس مقالہ کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

انسان ذہنی، تمدنی، سماجی اور معاشی حیثیت سے آج جس مقام پر کھڑا ہے اس تک پہنچنے کے لیے اس نے بیش بہا مشقتیں برداشت کی ہیں اور بے اندازہ قربانیاں دی ہیں۔ تاریخ کی کھیتی بنی نوعِ آدم نے اپنے خون کے فواروں سے سیراب کی ہے، اس میں اپنی ہڈیوں کی کھاد ڈالی ہے اور اس کی کیاریوں میں آنسوؤں کی شبنم برساتی ہے۔ اس خاکی مخلوق نے فطرت کی طاقتوں ــــ موسمی حالات، درندوں، زلزلوں اور مختلف طبعی حوادث

کا سامنا کر کے ہی کرتے سے امتحان نہیں دیتے ہیں بلکہ خود اپنی نوعی برادری کے ہاتھوں سنگین ترین مظالم برداشت کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے دردناک ترین حزنیے وہ ہیں جو خود انسان کے ہاتھوں سے پیش آئے۔ حملہ آوروں اور مجرموں جابروں اور ظالموں نے بار بار اس بری طرح تہذیب کے چہرے کو لہولہان کیا کہ آج بھی ہم اپنے ان تاریخی زخموں کی ٹیسیں محسوس کرتے ہیں۔

تاریخ کا سب سے بڑا بھگتان | انسانیت نے اپنے ہی فرزندوں کے ہاتھوں جو بھگتان بھگتے ہیں ان میں سے سب سے اذیت ناک اور روح کش تجربہ نظامِ استبداد کا تھا جو مختلف زمانوں میں مختلف روپ اختیار کرتا رہا ہے۔ کبھی فاتحین کی لہراتی ہوئی تلواروں نے اسے گردن جھکانے پر مجبور کیا، کبھی اشرافی طبقوں کے گٹھ جوڑ سے موروثی بادشاہت نے اپنے تخت کے پائے اس کے کندھوں پر ٹکائے، کبھی درباری سازشوں کے کامیاب ہیروؤں نے اسے اپنا شکار بنایا اور کبھی مذہبی طبقوں نے اپنی غلامی کا مقدس جوا اس کے گلے میں ڈالا۔ نظامِ استبداد نے اس سے اس کی کمائیاں چھینیں، اس سے بیگاریں حاصل کیں، اس کی کھال کوڑوں سے ادھیڑی اور جب چاہا اسے کولہو میں بیل دیا۔ نظامِ استبداد نے بدترین ظلم اس کے ساتھ یہ روا رکھا کہ اس سے اس کے ضمیر کی آزادی چھین لی، اسے خودی سے محروم کر دیا، اس سے اپنے بھلے برے کے سوچنے کا حق سلب کر لیا، اس کے لیے اظہارِ خیال کی راہیں بند کر دیں۔ یہ کتنی بڑی گھٹن ہو گی کہ آدمی اس مبغوض طاقت کے سامنے سجدۂ اطاعت گزارے جسے اس کی روح اپنا جائز فرماں روا ہی نہ مانتی ہے، ان قوانین اور ضابطوں اور احکام کی تعمیل کرے جو مطمئن کرنے والی کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں، اس نظام کو واجب الاحترام مانے جس کی تشکیل میں اس کی آزاد مرضی کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس تمدن کی حفاظت کرے جس میں اس کی فلاح و بہبود کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ انسان کو ایسے عقیدے اور نظریے ماننے پر مجبور کیا گیا جن سے

اس کے عقل و وجدان کو انکار تھا، اس سے ایسے ضابطوں کی تائید حاصل کی گئی جن کو وہ دل سے لغو سمجھتا تھا، اس سے ایسے نظاموں کے لیے قربانیاں مانگی گئیں جن کو وہ جھوٹ اور بدی کے بڑے پیمانے کے مظاہرے قرار دیتا تھا۔ اسے ایسی حالتِ خوف میں رکھا گیا جس میں اپنے شرفِ انسانیت کو محسوس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے نظامِ استبداد نے صدیوں در صدیوں لمبے زمانوں میں ایک بے بس حیوان بنائے رکھا۔

لیکن یہ انسانی عظمت کا ایک بدیہی ثبوت ہے کہ بربریت کے ہاتھوں سنگین حالات کی چکی میں متواتر پسنے، کندھوں پر جبراً ٹھونسے ہوئے فرائض کے کوہ گراں لادے رکھنے، پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں پہننے اور ضمیر پہ پہرے اور زبان پر مہریں لگنے کے باوجود انسان کی خودی پھر بھی سر اٹھاتی رہی۔ انسانیت نے تلواروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر، انگاروں پر لوٹ کر اور پھانسیوں پر لٹک کر ظلم کی طاقت کو چیلنج کیا اور اس سے آزادی اور مساوات اور جمہوریت کا حق مانگا۔ ہر دوسرے مقصد سے زیادہ عظیم اور وسیع قربانیاں اس مقصد پر صرف ہوئیں اور آج انہی قربانیوں کے طفیل اس کرۂ ارضی پر یہ ممکن ہوا ہے کہ آدمی انسانیت کے بنیادی حقوق سے استفادہ کر سکے یا نسبتاً زیادہ جرأت اور سہولت کے ساتھ ان حقوق کا مطالبہ کر سکے۔

نظامِ استبداد ـــ چاہے وہ دورِ قدیم کی بادشاہت کی شکل میں ہو یا دورِ حاضر کی انفرادی یا جماعتی آمریت کی شکل میں، بلکہ وہ کسی جمہوری قبا میں کیوں نہ پاکوبی کر رہا ہو ـــ وہ لازماً انسانی مساوات کی نفی پر کھڑا ہوتا ہے۔ کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی پارٹی یا کوئی طبقہ جب قوت کی تلوار سونتے نمودار ہوتا ہے اور غیر محدود شدہ اقتدار اس کے ہاتھ آجاتا ہے تو وہ حکم چلانے، لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے، لوگوں کے بھلے برے کو سوچنے، آزادیوں پر قیدیں اور افکار و اعمال پہ پابندیاں عاید کرنے، حقوق و فرائض کی تقسیم کرنے، اور خیر و شر کے پیمانے بنانے کا واحد اجارہ دار بن بیٹھتا ہے۔ سو وہ دوسروں کو سوچنے،

استدلال سے کام لینے، اظہار رائے کرنے، اختلافی آواز اٹھانے اور تنقید و احتجاج کرنے سے بالجبر باز رکھتا ہے۔ وہ اذن نہیں دیتا کہ محکوم حالات میں کوئی تبدیلی کرنے کے لیے جد و جہد کرے۔ وہ عوام کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی ہر مرضی کی تائید کریں، اس کی ساری حماقتوں پر داد دیں، اس کے انتہائی سیاہ کارانہ مظالم پر خراج تحسین پیش کریں غرضیکہ وہ نظامِ زندگی کو ایک ایسا فولادی پنجرہ بنا دیتا ہے جس میں انسانی خودی پھڑپھڑاتی رہتی ہے اور کوئی راہِ نجات نہیں پاتی۔ انسانی عزم کا سب سے زریں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس فولادی پنجرے کو بھی توڑ ڈالا ہے

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

ظلم کی چکی میں پستے ہوتے انسان بھی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ "ہم بھی انسان ہیں" ان کے خاکستر میں شعورِ مساوات کی چنگاری بار بار تپش دکھاتی رہی اور جب یہ پوری طرح بھڑک اٹھی تو قفسِ استبداد کی سلاخیں پگھل گئیں۔ "ہم بھی انسان ہیں" اور "ہم بھی سوچتے ہیں" کا شعور ہمیشہ چیخ اٹھتا رہا کہ ؏

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

وہ حالت نظامِ استبداد کے بالکل برعکس ہوتی ہے جبکہ نظامِ حیات مساواتِ انسانی کے تصور پر کھڑا ہو جاتے۔ ایسے نظام کو دورِ جدید کی اصطلاح میں "جمہوریت" کہتے ہیں۔

انبیاء کا درسِ مساوات | جمہوریت کی کہانی کا آغاز بالعموم یونان کی یک شہری اشرافی ریاست کے تذکرے سے کیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس کی ابتدا بہت دُور سے ہوتی ہے۔ اس کے اصل علمبردار اور داعی وہی رہنمایانِ انسانیت تھے جنہوں نے اسے دوسری تمام زندگی افروز درخشاں قدروں سے مالا مال کیا ہے۔ یعنی انبیاء علیہم السلام — انبیاء نے

خدا تعالیٰ واحد کا وہ تصور دلایا جو تمام انسانوں کو ایک ہی مقامِ عبدیت پر لے آتا ہے۔ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، سارے انسان یکساں خاکی نژاد ہیں، سارے انسان ایک فطرت پر اٹھائے گئے ہیں اور یکساں ضروریات رکھتے ہیں، سارے انسان دل و دماغ سے آراستہ ہیں۔ سارے انسان سوچتے ہیں اور سارے انسان زندگی اور تمدّن میں یکساں حصہ دار ہیں۔ ان میں سے کوئی دوسروں پر خدائی جمانے کا حقدار نہیں، کوئی اپنا من مانا حکم چلانے کا اجارہ دار نہیں، کوئی دوسروں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا نہیں، کوئی اوروں کے بھلے اور بُرے کا فیصلہ کرنے والا نہیں، کوئی دوسروں پر فوقیتیں، ترجیحات اور امتیازات نہیں رکھتا، کوئی دوسروں کے ضمیروں اور ذہنوں پر قدغنیں لگانے کے لیے خصوصی اختیارات لیکر پیدا نہیں ہوا، اور کسی کو قدرت نے ظلم و استبداد کرنے کا پٹہ لکھ کر نہیں دیا۔ جبر و استبداد کے خلاف قدیم ترین ادوار میں اسی تصور نے بغاوت کی لہریں اٹھائی ہیں۔ اسی تصور کو لیکر انبیاء اور ان کے پیروؤں نے بڑی بڑی ظالم قوتوں کو چیلنج کیا ہے۔ ہم ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کے سامنے، موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے، عیسیٰ علیہ السلام کو رومی حکومت کے سامنے اسی تصورِ خدا، تصورِ انسان اور اصولِ مساوات کا پیغام سناتے دیکھتے ہیں۔ اس راہ میں نہایت ہی عظیم قربانیاں دینے والے بھی خود انبیاء ہی تھے۔ کہیں ان پر پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔ کہیں ان کو آگ کے الاؤ میں پھینکا جاتا ہے، کہیں انہیں اسیرِ زنداں کیا جاتا ہے کہیں ان کے لیے سولیاں آراستہ کی جاتی ہیں اور کہیں ان کے سروں پر آرے چلا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی اٹھائی ہوئی آوازِ حق کی گونج کبھی ختم نہ کی جاسکی اور ان کی قربانیاں آہستہ آہستہ رنگ لاکر رہیں۔ انہی کی انسانیت نوازیوں کی برکت ہے کہ انسانیت کے بہت سے بنیادی حقوق کم از کم اصولی طور پر آج دنیا کے مسلّمات میں داخل ہو چکے ہیں۔ سچی اور مکمل جمہوریت کے نمونے وہ نظام تھے جو ان رہنمایانِ عالم کے ہاتھوں قائم ہوتے رہے۔

انسانی نظامِ اخوت انبیاء کے مشن کی تکمیل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے

ہوتی ۔ حضورؐ ایسے دور میں اپنا پیغامِ انقلاب لے کے اٹھے تھے جبکہ نظامِ استبداد اپنے جوبن پر تھا ۔ روم و ایران اس وقت انسانی تمدن کے قافلہ سالار تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ بادشاہت، درباری اشراف، جاگیردار اور مذاہب کے اجارہ دار اپنی ملی بھگت سے انسانیت کو استبداد کے قفس میں جکڑے ہوتے تھے ۔ عام انسان چند خواص کی خدائی کا جوا اٹھائے ہوتے تھا اور اسے مجالِ دم زدن نہ تھی ۔ خود عرب میں قریشی متولیانِ کعبہ، مکہ اور طائف کے سود خواروں اور جرائم پیشہ قبیلوں نے عام لوگوں کے لیے غلامی، خوف اور بے بسی کی حالت پیدا کر رکھی تھی ۔ ایسے میں آپ توحید کے ساغر میں انسانی مساوات کی وہ صہبا لے مقدس پیش کرتے ہیں کہ جس کا ایک جرعہ پی کر غلام اور کنیزوں تک میں احساسِ آزادی کا وہ نشہ پیدا ہوا کہ اگرچہ ان کو تپتی ریتوں پر لٹا یا گیا، دہکتے انگارے ان کی پیٹھوں کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے، گلوں میں رسیاں ڈال کر ان کو گھسیٹا گیا، ان کی چھاتیوں پر بھاری پتھر رکھے گئے، ان کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا اور برچھیاں ان کے جسموں سے پار کی گئیں مگر ان کے سرورِ ازلی میں فرق نہ آیا۔ جب انہوں نے اپنے شرفِ انسانی کے تصور کا ذائقہ چکھ لیا تو پہلی بار ان کے شعور نے انگڑائی لی، ان کی قوتِ ارادی جاگ اٹھی، ان کے کردار نے نئی کونپلیں چھوڑیں اور ان میں ظلم کو بے حسی سے سہنے کے بجائے پورے نظامِ ظلم کے خلاف انقلابی جد و جہد کرنے کا ولولہ بیدار ہو گیا ۔ یہاں تک کہ انسانوں کا ایک معیاری نظامِ اخوت قائم ہوا جو قیام کے بعد دس ہی برس میں دس بارہ لاکھ مربع میل علاقے پر چھا گیا۔

ہم اس نظام کا تفصیلی خاکہ آخری حصے میں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ نظام اقتصادی مساوات، ذہنی مساوات، سیاسی مساوات، قانونی مساوات اور معاشی مساوات کے کامل ترین مگر قابلِ عمل اصولوں پر مبنی ہے۔

اسلام اور یورپ کا دورِ جدید یورپ کے ذہنی مطلع پر دورِ جدید کی جو پہلی روشنی نمودار ہوئی وہ اسلام کی ان چند شعاعوں کا نتیجہ تھی جو یلغار کرتی ہوئی اُس پار جا پہنچی تھیں۔

قدرت کا یہ تاریخی قانون کہ جس قوم کے پاس اعتقاد، فکر، علم اور اخلاق کی روشنی موجود ہوتی ہے (ـــ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی متاعِ خیر کے ساتھ کچھ اسبابِ فساد بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں) وہ امامت و قیادت کے منصب پر آجاتی ہے اس کے اندر ایک طرح کا احساسِ فرض پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی فلاح کا جو پیغام اس کے پاس ہے اسے دنیا کے ہر گوشے تک پہنچائے۔ اسلام نے جب اپنے پیروں کو زندگی کی حقیقت کا نیا شعور دیا، ان کو اخلاقی روح سے آراستہ کیا، ان کے ذوقِ علم و عمل کو بیدار کر دیا، انہیں نئے نئے سیاسی و سماجی ادارات کا معمار بنا دیا تو قانونِ فطرت کے تحت از خود ان کا منصب یہ قرار پایا کہ وہ فکر و عمل کی نئی روشنی کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ اس مقصد کے لیے دینِ حق نے ان کو شہداء علی الناس اور امت وسط قرار دیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا بین الاقوامی مشن ٹھہرایا۔ چنانچہ مسلم قوت جب اپنی مشعلِ دعوت اٹھا کے ریگستانِ عرب سے نکلی تو ان کے سامنے زمینیں فتح کرنے اور دولت حاصل کرنے اور سلطنت بنانے کا مقصد نہ تھا بلکہ وہ انسانیت کے سامنے فلاح کا سندیسہ لے کر معلمانہ جذبے سے گئے اور عام آدمی کو انہوں نے سیاسی، مذہبی، معاشی اور سماجی استبداد کی زنجیروں سے نجات دلانے کا فرض ادا کیا۔ انہوں نے اسی جذبے سے روم و ایران کی شہنشاہیتوں کو توڑا اور عوام کو ایک نظامِ رحمت سے مالا مال کر دیا۔ پھر جو یہ سلسلہ چلا تو مصر، افریقہ، ہند و افغانستان، چین و ترکستان اور ہسپانیہ و اندلس تک فتوحات کے ریلے بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد جب بادشاہت کا دور شروع ہوا تو سلطنت خود ایک مقصود بن گئی اور فتوحات سیاسی و اقتصادی فوائد کے لیے بھی کی جانے لگیں مگر ان کوششوں میں داعیانہ و معلمانہ روح بھی دبی دبی موجود رہی۔ شاہانہ فتوحات بھی اسلامی نظریۂ توحید، افکار و علوم، نئے تمدنی ادارات، اخلاقی اقدار، اصولِ عدل و مساوات اور خدا پرستانہ ثقافت جیسی نعمتوں کو انسانیت تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی رہیں

دورِ بادشاہت ہی میں اسلام کی روشنی مغربِ اقصیٰ تک پہنچی۔ عبدالملک اموی کے دور میں عقبہ بن نافع کی یلغار طنجہ تک جا پہنچی (۶۸۳ء) اس کے بعد قرطاجنہ (CARTHAGE) پر مستقل قبضہ (۶۹۸ء) میں ہوا۔ سلیمان (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) کے عہد میں محمد بن عبدالرحمٰن الثقفی نے جبل البرانس سے گزر کر جنوبی فرانس پر حملہ کیا۔ ہسپانیہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت کا آغاز جنرل طارق کی فاتحانہ یلغار سے ہوا۔ (۷۱۱ء) جو جنرل موسیٰ بن نصیر کے تعاون سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اموی خلیفہ ہشام کے پوتے امیر عبدالرحمٰن (۷۵۶ء تا ۷۸۸ء) نے ہسپانیہ میں باقاعدہ اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تعمیری سرگرمیوں کا دور، عبدالرحمٰن ثالث کے دور (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) میں ہوا اور قرطبہ نہ صرف سیاست، تجارت و صنعت کا بڑا مرکز ٹھہرا بلکہ یورپ کا سب سے بڑا سرچشمۂ علم و فکر بن گیا۔ طب، ریاضیات، فلسفہ و حکمت اور شعر و ادب کی درسگاہیں کھل گئیں، کتب خانے قائم ہو گئے۔ یونانی اور لاطینی کتابوں کے تراجم کی مہم چل پڑی اور ساتھ کے ساتھ صنعت کاغذ سازی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہی درسگاہیں، دار التراجم، کتب خانے، کاغذ کے کارخانے اور علمی حلقہ ہائے بحث اسلام کے علم و فکر کو یورپ کے ہاتھ منتقل کرنے کا واسطہ بنے۔ اسی واسطے سے انسانی مساوات، علمی بیداری اور فکری آزادی کا پہلا پیغام مغرب کے ظلمت زدہ انسان کو ملا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز بتاتا ہے کہ:

> عرب فاتحین کے نقوشِ قدم کے ساتھ ساتھ علم کی لہریں اٹھتی چلی گئیں۔ آٹھویں صدی تک عربوں کی پوری زیرِ نگیں دنیا میں ایک طرح کی تعلیمی تنظیم کارفرما ہو گئی۔[1]

اور ـــــ

> ارسطو اور کتب خانۂ اسکندریہ کے بیج جو عرصہ دراز سے بے نمو اور نظر انداز شدہ تھے، از سرِ نو تازہ ہو گئے اور برگ و بار لانے کے لیے نشو و نما پانے لگے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو POCKET HISTORY OF THE WORLD. P: 214.

[2] ایضاً ص ۲۱۶ ـ

اور ـــــ

" دنیا بھر میں عام آدمی کا ذہن اس شان سے یک بیک بیدار ہوا کہ اس سے پہلے انسانیت کو ایسا تجربہ کبھی پیش نہ آیا تھا"[۱]

ایک حوالہ اور ـــــ

" وہ (یعنی چارلس مارٹل) مسلمانوں کو فرانس سے نکال دینے میں کامیاب ہو گیا مگر وہ ہسپانیہ میں جمے رہے جہاں عبدالرحمٰن نے کارڈوا کی خلافت کی بنا رکھی جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے لیے حکمت و فنون کا عظیم ترین مرکز بن گیا"[۲]

ایک قول بریفالٹ کا بھی ـــــ

"... بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور ان کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئیں"[۳]

یہ تھا نقشہ احوال جس میں مسلمانوں کا اصولِ مساواتِ انسانی فکری آزادی کی رَو اپنے ساتھ لیے ہوئے مغرب تک پہنچا اور یہی تحریکِ اصلاحِ مذہب، فکری نشاۃ ثانیہ اور جمہوری تحریک کا اوّلین محرک بنا۔ مساواتِ انسانی کے اسلامی اصول کا مغربی تصانیف میں اعترافِ عام پایا جاتا ہے۔ ایچ جی ویلز بھی " خدا کے سامنے تمام اہلِ ایمان کی مکمل اخوت و مساوات" کو ایک اصولی حقیقت، اور عربوں کی کامیابی کی کلید سمجھتا ہے۔ (ہسٹری آف ورلڈ صفحہ ۲۱)۔ اس کے نتیجے میں پہلے پاپائیت کے خلاف اور پھر بادشاہت کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ بعد میں اسلامی اثرات کی ایک نئی پُر زور لہر صلیبی جنگوں کے دوران میں مغرب تک پہنچی صلیبی

۱ POCKET HISTORY OF THE WORLD – BY H. G. WELLS. P: 254

۲ THE STORY OF MANKIND—H. VAN LOON.. P: 143

۳ THE MAKING OF HUMANITY. P: 19

جنگیں لاکھوں یورپین نوجوانوں کے لیے ایک عمومی درسِ تہذیب بن گئیں۔ ہوتا یہ کہ جب صلیبی جنگجو میدان سے لوٹ کر جاتے تھے تو وہ ان اعلیٰ اطوار کے معترف اور مبلغ بن کے جاتے تھے جن کا مشاہدہ وہ دشمن مسلمانوں میں کر چکے ہوتے تھے۔ ان میں وسیع تر طرزِ زندگی کی تمنا انگڑائیاں لینے لگتی تھی جو نہ کلیسا انہیں دے سکتا تھا، نہ ریاست[1] اور پھر ان کا تأثر یہ تھا کہ :

"مبارک ہے صلاح الدین جس کی گردن پر کسی پوپ کا جُوا نہیں"[2]

پھر تیسری بار نئی فکری و تمدنی لہریں اس وقت یورپ کی طرف اٹھیں جبکہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا (۱۴۵۳ء) اور اس علمی مرکز سے عیسائی علماء، مفکرین اور اساتذہ کی تعدادِ کثیر بھاگ کر اٹلی میں پناہ گزین ہوئی اور یورپ کو ایسے بے شمار معلّمین ہاتھ آگئے جنہیں مسلم فکر نے روشن دماغ بنایا تھا[3] اور یہ واضح ہے کہ ۱۵ ویں صدی کے اواخر سے سولہویں صدی تک کا دور نشأۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کا دور ہے[4]۔ پاپائیت کے خلاف معرکہ | اسلام کا پہلا نمایاں اثر یورپ پر یہ پڑا ۔۔۔ اور اس میں دوسرے تاریخی اسباب بھی یقیناً ممد ہو گئے ۔۔۔ کہ کلیسا کے خوفناک استبداد، پوپ کی خداوندی اور مذہبی اوہام و رسوم کے خلاف معرکہ کا آغاز ہوا۔ اس معرکہ میں ذہنی جمہوریت کی روح کارفرما تھی۔

کلیسائے روم ایک ایسے مذہب کا بارِ گراں عوام پر لادے ہوئے تھا جو اُنھے

---

[1] THE STORY OF MANKIND P:173

[2] چیمبرس انسائیکلو پیڈیا ج ۸

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں (۱) CAMBRIDGE MEDIAEVAL HISTRY. (۲) (SOCIAL AND POLITICAL IDEAS OF THE RENAISSANCE — HEARNSHAW.) (۳) THE RENAISSANCE — PETER.

[4] یاد رہے کہ اسی دور میں (۱۴۳۸ء) جرمنی کے گٹن برگ نے چھاپہ خانہ کی ایجاد کی تھی۔

ہوتے تھے عقاید، تاریک خیالیوں، اوہام، من گھڑت رسموں، ہولناک رہبانی طریقوں پُرپیچ ضابطوں سے مرکب تھا۔ اس مذہب کے ذریعے مذہبی طبقہ بے پناہ دولت بھی عوام سے حاصل کرتا تھا اور ان پر نہایت سخت مستبدانہ اقتدار بھی قائم کیے ہوتے تھا۔ کلیسائی ادارے ایک طرف عیاشی اور ہوس رانی کے اڈے بن گئے اور دوسری طرف بادشاہت کے مقابلے میں مذہبی اقتدار کو غالب رکھنے کے لیے وہ طرح طرح کی دسیسہ کاریوں اور سازشوں کے مرکز بھی ٹھہرے۔ تعیش پسندی کا حال یہ تھا کہ پوپ لیو دہم نے سابق پوپ کی جمع کردہ دولت پر ہاتھ صاف کیا، اپنے دور کی آمدنی کو اڑایا اور پھر اپنے جانشین کا حق پیشگی وصول کرکے اسے بھی خرچ کر دیا۔ اور سیاسی لحاظ سے کلیسا کے جوڑ توڑ کی قوت اتنی عظیم تھی کہ شاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء کو پوپ کے حضور میں حاضر ہو کر عفو طلبی کرنی پڑی۔ مذہبی طبقہ کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے پادریوں کے خلاف اخلاقی نوعیت کے الزامات عائد ہو رہے تھے۔ اور انسانی ضمیر کو کچلنے میں کلیسا کی بے باکی اتنی بڑھ گئی کہ ذرا سی اختلافی آواز اٹھانے کے گناہ گار کی وہ تکفیر کرکے اسے قتل کر دیتے یا زندہ جلوا دیتے۔[1]

مسلم فاتحین، ان کی درسگاہوں، ان کی تصانیف و تراجم، ان کی بحثوں اور ان کی مذہبی زندگی کے عملی مظاہر نے اہلِ مغرب پر جو فوری اثرات پیدا کیے ان کا اندازہ ہم کلاڈیس (CLADIUS) نامی لاٹ پادری کے ذہنی انقلاب سے کر سکتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں اندلس کی نئی فضا میں پرورش پا کر وہ بت پرستی کے خلاف دعوتِ اصلاح لے کے اٹھا اور اپنے وعظوں کے دوران میں وہ مجمعوں کے سامنے تصویریں اور صلیبیں جلا دیا کرتا تھا۔ اسی طرح شاہانِ روما میں سے لیو سوم، قسطنطین پنجم اور لیو چہارم تصویر پرستی کے خلاف ہو گئے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (۱) مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا ابوالحسن علی ندوی (۲) انسانیت کی تعمیر نو از پروفیسر عبدالحمید صدیقی۔ (۳) تاریخ انقلاباتِ عالم۔ مولانا ابوسعید بزمی مرحوم (۴) معرکۂ مذہب و سائنس، مولانا ظفر علی خان مرحوم۔ (۵) تاریخ اخلاق یورپ۔

۷۲۶ء میں باقاعدہ سرکاری فرمان سے تصاویر اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی۔ اسی طرح شہادت موجود ہے کہ کالون (CALVIN) کے اختیار کردہ بعض عقاید اور فقہی مسائل یونانی کلیسا کے بجائے اسلامی علماء کے تصورات سے مشابہ تھے۔[1]

ذہنی بیداری (RENAISSANCE) جو مسلمانوں سے میل جول، جنگ و جدال، بڑھتی ہوئی نقل و حرکت، سیاحت و مشاہدات، توسیع پذیر تجارت، بحری سفروں کے فروغ، خود مختار اور نیم آزاد شہروں کے وجود، یونیورسٹیوں کے قیام، کاغذ سازی کی ترقی اور چھاپے خانے کی ایجاد کے مختلف عوامل کا نتیجہ تھی، اس کی ابتدائی لہروں نے اپنا راستہ عقلی علوم شعبہ ہائے ہنر اور ادب و فنون کے میدانوں کی طرف نکالا یونانی تراجم کی مانگ پیدا ہوئی اور گذشتہ تمدنوں کے شاندار مظاہر کی طرف توجہ ہوئی جس کی وجہ سے یہ احساس بڑھنے لگا کہ ہماری موجودہ زندگی نہایت پست ہے۔ نظری امور میں دلیل، عملی فنون میں تجربہ اور ثقافتی معاملات میں حسن کی اہمیت بڑھ گئی۔ شروع میں یہ رو مذہبی دائرہ سے باہر باہر ہو کر چلی مگر آخر تصادم ناگزیر تھا۔ انجیل کی روائتی تفسیر، کلامی منطق اور افسانہ ہائے پارینہ کے مقابلے میں جب لوگوں کی توجہ فلسفہ، جغرافیہ، طب اور دوسرے طبیعاتی علوم کی بحثوں نے کھینچی اور جب نئے نظریات کلیسائی تصورات کو متزلزل کرنے لگے تو کلیسا نے ذہنوں اور ضمیروں کو کچل دینے کی ٹھانی۔ آگے چل کر عدالت احتساب (INQUISITION) قائم ہوئی اور اس نے ایک ایک آزاد خیال کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ اس عدالت کا شکار ہونے والوں کی تعداد ۳ لاکھ سے کم نہ تھی جس میں ۳۲ ہزار کو زندہ جلایا گیا — برونو (BRUNOE) اور گلیلیو (GALILIO) جیسے علما نہایت بے ضرر اور معمولی انکشافات کی بنا پر اس عدالت کی بھینٹ چڑھے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو: THE PREACHINGS OF ISLAM - T.W. ARNOLD

[2] 1- THE INQUISITION — MAYCOCK. 2- MEDIEVAL HERESY AND THE REQUISITION — TURBURVILLE.

پاپائیت کے جرائم کا پیالہ جب خوب لبریز ہو گیا تو عوام کے اندر اضطراب کا لاوا پکنے لگا۔ پھر اس لاوہ نے بہاؤ کے راستے نکالے۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی ان میں خود کلیسا کا ایک وفادار فرزند بھی پیش پیش تھا۔ یہ تھا ڈیزیڈیریس ارازمس (DESIDERIUS ERASMUS) جو ہالینڈ میں پلا اور ایک لاطینی اسکول ڈیونٹر (DEVENTER) میں تعلیم سے بہرہ مند ہوا۔ وہ باقاعدہ راہب بن کر ایک خانقاہی حلقہ میں رہا۔ سیاحت کر کے اس نے زمانے کا رنگ خوب دیکھا۔ پھر اس نے مضمون نگاری شروع کی اور اپنے شذرات میں گرجاؤں اور درویشوں کا حال نہایت پُر الم طرح شرح کیا۔ پھر اس نے "تحسینِ حماقت" (PRAISE OF FOLLY) کے دلچسپ عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں راہبوں اور ان کے مریدوں کا پول کھولنے کے لیے طنز و مزاح جیسا کامیاب ہتھیار استعمال کیا۔ سولھویں صدی میں یہ کتاب بچہ ہاتھوں ہاتھ بکا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ اس کی تحریری مہم نے لوگوں کو چونکا دیا۔

ارازمس قلم کش تھا، لیڈر نہ تھا۔ کلیسا کے خلاف تحریک چلانے کے لیے جس لیڈر کی ضرورت تھی وہ مارٹن لوتھر کے پیکر میں نمودار ہوئے۔ مارٹن لوتھر شمالی جرمنی کے کسانوں میں سے اٹھا، اس نے ارفرٹ (ERFURT) یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ایک خانقاہی حلقے میں شامل ہو گیا۔ پھر وہ ڈین برگ کے اسکول میں دینیات کا پروفیسر تھا۔ یہاں اس نے کتابِ مقدس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس تضاد کو محسوس کیا جو تعلیماتِ مسیحؑ اور پوپ اور بشپوں کے مواعظ میں تھا۔ اس کے ذہن میں بغاوت کی لہر اٹھنے لگی۔ آخری محرک یہ پیدا ہوا کہ الگزینڈر ششم چونکہ پاپائی خزانے کا صفایا کر گیا تھا جس کی ایجنسی مقامی پادری جان ٹیٹزل (JOHN-TETZEL) کے پاس تھی۔ لوتھر کے صبر کا پیمانہ اس موقع پر لبریز ہو گیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو اس نے ایک سنگین قدم اٹھا دیا۔ اس نے ۹۵ نکات کاغذ پر لکھے اور

ؔ THE STORY OF MANKIND. P-256-258

اسے عین گرجا کے دروازے پر جا کر آویزاں کر دیا اور پادری کو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ لوتھر کے خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ صرف انجیل مذہب کے لیے سند ہے اور اس پر عمل کرنا نجات کے لیے واحد ذریعہ ہے، خدا اور بندوں کے درمیان کسی واسطے کی حاجت نہیں، پادریوں کے ذریعے ان کی ایجاد کردہ رسوم کا عمل میں آنا کوئی مذہبی ضرورت نہیں۔ عشائے ربانی کی تقریب سے متعلق عقیدے باطل ہیں اور مذہبی بزرگوں کے بتوں کی پرستش عیسائیت کے خلاف ہے۔ دو مہینے کے قلیل عرصے میں لوتھر کے ۹۵ نکات پر بحث کا طوفان سارے یورپ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ احتساب کے شکنجے میں کسا جائے لوتھر کے حامیوں کی بے شمار صفیں ابھر آئیں۔ ۱۵۲۰ء میں دریائے رائن کے کنارے ڈائٹ (DIET) کا اجلاس عام بلایا گیا اور چارلس پنجم کے حکم سے لوتھر سے جواب طلبی کی گئی۔ لوتھر نے اپنا ایک لفظ بھی واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر کہ اس کا ضمیر کلماتِ الٰہی کا پابند ہے اور وہ ضمیر ہی کے لیے جیے اور مرے گا! ڈائٹ نے اسے خدا اور انسانیت کا باغی قرار دے کر حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص اسے جگہ نہ دے، نہ دانہ، نہ پانی اور نہ اسے باغیانہ تقریروں کا کوئی لفظ پڑھنے دیا جائے۔ مگر وہ وارٹ برگ کی ایک گڑھی میں محفوظ بیٹھ گیا اور اس زمانے میں انجیل کا ترجمہ کر ڈالا تاکہ ہر شخص خود اسے پڑھے اور احکامِ الٰہی کو جانے۔ اس طرح مذہبی علم کے قدیم خُم کی مہر ٹوٹ گئی۔[1]

یوں پروٹسٹنٹ تحریک چلی اور پھر اس کے نتیجے میں مذہبی آزاد خیالوں کا ایک مذہب و مسلک وجود پا گیا۔

لوتھر، کالون اور اصلاحِ مذہب کے دوسرے علمبرداروں کو کام کرنے کا موقع اس کشمکش کی وجہ سے ملا جو پاپائیت اور بادشاہت کے درمیان شدت سے جاری تھی۔ یہ لوگ اپنی جدوجہد میں دنیوی طاقت کی حمایت کے محتاج تھے تاکہ وہ اپنے آپ کو پنجۂ عقوبت میں

---

[1] ملاحظہ ہو: HISTORY OF THE REFARMATION—LINDSARY

گرفتار ہونے سے بھی بچا سکیں اور کیتھولک بادشاہوں اور پاپائیت کے درمیان اپنے آپ کو توازن کے ساتھ قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے پاپائیت کے مخالف بادشاہوں کا دامن تھام کر یہ معرکہ جاری رکھا۔ بنا بریں مطلق العنان حکمرانی کا جو ادعا بادشاہوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا یہ لوگ اس کی تائید کرنے پر مجبور ہوتے۔ چنانچہ یہ "مطلق العنان بادشاہت کے محافظین" (DEFENDERS OF THE ABSOLUTE MONARCHY) قرار پاتے۔ یہ ایک عجیب صورت تھی کہ ایک طرف مذہبی دائرے میں یہ عام انسان کو پادریوں کے مقابلے میں مساویانہ اور جمہوری مرتبہ دلوا رہے تھے اور دوسری طرف بادشاہوں کی خدائی کی گرفت مضبوط کر رہے تھے۔ خصوصاً کالوِنزم (CALVINESUM) اور زونگلزم (ZWINGLISM) نے کلیسا اور ریاست کو ایک کرنے کی ٹھانی، نیز وہ تمام بادشاہ جو پاپائے روم کا قلادہ گلے سے اتار سکے انہوں نے اپنے آپ کو خدائی نمائندہ اور بالاتریں سرپرستِ مذہب بھی قرار دے لیا۔ اس طرح قومی بادشاہتوں کی مطلق العنانی کا زور وحدتِ روما کے ٹوٹنے کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔ اصل میں اصلاح پسندوں کے لیے دو خوفناک طاقتوں سے بیک وقت لڑنا قابلِ عمل نہ تھا۔ مگر آزاد خیالی اور جمہوریت کی جو رَو مذہبی دائرے سے ایک بار اٹھ گئی تھی، آگے چل کر اس سے سیاسی دائرہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ عام لوگوں نے جب پاپائیت کے خلاف جنگ لڑنے کے بعد بھی اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ محکوم و مجبور پایا تو ان کی ذہنی آزادی کی لہروں نے ایوانِ بادشاہت کی طرف رُخ کر لیا۔ اس طرح جمہوری تحریک چلی۔

یونانی جمہوریت کا تصور

تبدیلی کی تحریک کسی بھی طرف سے ہو، انسانی معاشروں کا معمول یہ ہے کہ وہ مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنی ہی ماضی سے سرمایۂ فکر حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یورپ کے لیے اولیں ذہنی تحریک تو اسلام نے بہم پہنچائی، لیکن مسلمانوں سے سرمایۂ فکر حاصل کرنے میں تعصب مانع ہوا۔ اس تعصب کے نقش لٹریچر اور تاریخ میں محفوظ ہیں بلکہ یہ آج تک بھی ایک حد تک کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو نہایت شدت سے

جاہل، کافر، مشرک، بے دین اور بدعتی کہا جاتا تھا اور قرآن یا دوسرے علوم دینی کے لیے دلوں کے دروازے بند تھے حتیٰ کہ شجاعت کی روح سے آراستہ جو کردار اس دور میں ان کے اندر نائٹ (KNIGHTS) کے نام سے ابھرا وہ اپنے حلف میں ہر مصیبت زدہ کی مدد کرنے کا اقرار اس لازمی استثنا کے ساتھ کرتا تھا کہ "بشرطیکہ وہ مسلمان نہ ہو" (جسے دیکھتے ہی قتل کر دینا اس کا فرض تھا)۔[1] بنا بریں وہ مسلمانوں کے جن نظریات و معمولات سے متاثر ہوتے انہیں اپنے ہی ماضی کے خزائن سے تلاش کرنا چاہتے۔ مساوات کے اصول پر جمہوری طرز زندگی اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و تمدنی ترقی کا ایک مثالی دور انہیں یونان کے ماضی میں دکھائی دیا اور دوسرا ایک دور روما میں۔ یونان سے ان کا ذہنی رشتہ تازہ کرنے کا واسطہ بھی مسلمان بنے مسلمانوں میں خود اس عہد میں یونانی علم و تمدن سے ایک مرعوبیت پیدا ہو گئی تھی اور یونانی علوم کے تراجم کر کر کے وہ اپنے نظریات کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر رہے تھے اور ارسطو اور افلاطون کو خوب اچھال رہے تھے پس یورپ نے ان سے اسلام کا پیغام قبول کرنے کے بجائے یونانی علوم کا پیغام قبول کر لیا۔ ہنڈرک وان لون کے بقول فلورنس میں یونانی زبان سیکھنے کی رو چل نکلی اور ہر کوئی ارسطو، ہومر اور افلاطون کے مطالعہ کا شائق ہو گیا۔[2] بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فلورنس میں عشرت پسندانہ یونانی ثقافت کا احیاء ہوا۔ اسی لیے اسے "عظیم الشان مرکز احیاء" قرار دیا گیا۔ اس مخالف مذہب رو کو روکنے کے لیے ایک جیالے پادری سوانرولا —— (SAVANARALA) نے وقتی کامیابی حاصل کی مگر جلد ہی حالات پلٹ گئے اور اسے مجرم قرار دے کر اذیت ناک طریق سے سولی دیا گیا اور اس وقت عوام خوشی سے تالیاں بجا بجا کر ناچے۔[3]

صورت یہ ہے کہ یورپ نے جمہوری دور کے آغاز کے لیے تحریک تو مسلمانوں سے حاصل کی، مگر نظریات

---

[1] THE STORY OF MANKIND P:160

[2] THE STORY OF MANKIND. P:216 [3] DUTY.

یونان سے لیے اب ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کی کہانی کو آگے لے چلنے کے بجائے پانچویں صدی قبل مسیح میں لے چلیں۔

یونان میں یک شہری جمہوری اشرافی ریاست کا جو تجربہ عمل میں آیا وہ جن بہت سے جغرافی اور تاریخی اسباب کے تحت ممکن ہوا ان میں سے ایک بڑا عامل یونانی علم و حکمت کی پیدا کردہ فضا تھی جسے ہومر، تھیلز، اناکسیمینڈر، فیثاغورث، ہیراکلیٹس، پرمینائیڈز، ایمپیڈوکلیز، انیکساغورث، لیوکیپس، ڈیماکریٹس، پروٹاغورث، سقراط، افلاطون اور دوسرے بےشمار فطین اصحاب کی کاوشوں نے بنایا تھا۔ ان میں سے سقراط کا امتیازی مقام یہ ہے کہ اس نے اپنے خون کے روغن سے روحِ جمہوریت کے چراغ کو روشن کر دیا۔ وہ گویا یونان کا ضمیر تھا۔ بعید نہیں کہ وہ خدائی نظامِ ہدایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہو، کیونکہ نہ صرف عقیدۂ توحید، بلکہ اس کا سارا کردار پیروانِ الہام سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے خلاف سرکاری بتوں کی عبادت سے انحراف اور نوجوانوں میں تخریبی رجحانات پھیلانے کے الزام میں جو مقدمہ چلایا گیا تھا اور جو سزائے موت سنانے پر ختم ہوا اس کے چند اقتباسات یہاں لانے ضروری ہیں تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ سقراط کے افکار سچی جمہوریت کے کتنے قیمتی بیج اپنے اندر رکھتے تھے۔ آخر ضمیر کے مطابق سچائی کی آواز اٹھانے اور حکومت سے اختلاف کرنے کے حق کو بچانے کے لیے جو شخص جان دے دیتا ہے اس سے بڑھ کر معلمِ جمہوریت کون ہو گا۔

سنیے سقراط اپنے ظالموں کے سامنے بیان دے رہا ہے:۔

"خدا ہے جو مجھے ہدایت کرتا ہے کہ میں اپنے اور دوسرے لوگوں کے اندر جھانک کر اربابِ دانش و بینش کا سا نصب العین پورا کروں۔"

"ایتھنز کے لوگو! میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت رکھتا ہوں لیکن میں صرف خدا کی اطاعت کروں گا، تمہاری نہیں! اور جب تک مجھے زندگی اور قوت حاصل ہے میں حکمت کی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کو پھیلانے سے

ہرگز باز نہیں آؤں گا . . . . کیونکہ تم جان لو کہ یہ خدا کا حکم ہے اور میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ میری فرماں برداریٔ خدا سے عظیم تر کوئی بھلائی اس ریاست میں نہیں پائی گئی ۔"

سزائے موت کا فیصلہ ہو جانے پر وہ آخری تقریر میں کہتا ہے :-

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آپ کسی کو اپنی فاسد زندگیوں پر ملامت کرنے سے روک سکیں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ فرار کا یہ طریقہ نہ تو ممکن ہے، نہ عزت مندانہ - آسان اور شریفانہ راستہ یہ نہیں کہ آپ دوسروں کو بے بس کر دیں ؛ بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنائیں ۔"

"اب ہمارے جدا ہونے کی گھڑی آگئی ہے اور ہم اپنے اپنے راستے پر مڑ جانے والے ہیں ـــــ میں مرنے کے لیے اور آپ جینے کے لیے : کونسا راستہ بہتر ہے، یہ صرف خدا ہی جانتا ہے[1] ۔"

دراصل سقراط دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی ایک تحریک لے کے چلا تھا، اس کے شاگرد افلاطون نے تحریک کو چھوڑ کر تفلسف کی راہ اختیار کی مگر جو کچھ دیا وہ نظری متاع تھی، پھر اس کے بعد ارسطو آتا ہے جس نے افلاطون کی نظری تعلیمات سے آگے بڑھ کر ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک عملی نظریہ دیا - چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ارسطو جدید مغربی فلسفہ کا باوا آدم قرار پایا - لیکن یہاں ہم کو یونانی فلسفہ کی سیر کرنے کے بجائے شہری جمہوریت کا جائزہ لینا ہے۔

شہری جمہوریت | بابل کے شاہ حمورابی کے کئی صدیاں بعد ہم ایک گروہِ انسانی کو دریائے ڈینیوب کے کنارے سے جنوب کی طرف کسی شاداب علاقے کی تلاش میں گامزن دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہیلین (HELLENS) تھے - انہی لوگوں نے یونان، علاقۂ ایجیئین اور ایشیائے کوچک

---

[1] ملاحظہ ہو: HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY-BY BERTREND RUSSEL. CH: XI

کے ساحلی قصبوں کو آباد کیا، انہوں نے وحشت و بدویت کے دور سے آگے نکل کر اپنی تہذیب بنائی اور انہی کے ہاتھوں یورپ کی تاریخ کا پہلا باب کھلا۔

یہ لوگ بدویانہ آوارہ گردی کے بعد جب مقیم ہوتے تو انہوں نے الگ الگ شہر (جو آج کل کے بڑے گاؤں جتنے تھے) بسائے اور ہر شہر معاشرتی و سیاسی لحاظ سے ایک مستقل یونٹ بنا۔ انہی میں سے ایتھنز اور اسپارٹا بھی تھے۔ ہر بدوی قوم میں آزادی کا ذوق زوردار ہوتا ہے (جس کی مثال عرب قبل از اسلام میں بھی ملتی ہے) اور اسی ذوقِ آزادی نے یونانیوں کو ایک وسیع سلطنت کے تحت جمع ہونے کے بجائے الگ الگ آزاد معاشروں کی شکل میں جینا سکھایا۔ شروع میں یہ شہری معاشرے مشترک ملکیت اور معاشی مساوات کے سادہ بدویانہ اصول پر قائم ہوئے۔ بستی کے تمام لوگ مل کر کسی ایک کو سردار بنا لیتے اور وہ اگر غلط رُخ اختیار کرتا تو اسے برطرف کرنے کا حق عام لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا۔ بعد میں آہستہ آہستہ آبادی خوش حال اور تنگ حال لوگوں میں تقسیم ہوتی گئی اور عام محنت کار آبادی کے مقابلے پر رؤسا (NOBLES) کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ دوسروں سے کام لینے کی وجہ سے آسانی سے بہترین ہتھیار جمع کر لیتے تھے اور جنگی فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لیے فارغ اوقات رکھتے تھے۔ یہ مضبوط عمارات میں رہتے تھے اور جنگ جو سپاہیوں کی خدمات خرید سکتے تھے۔ یہ نوبل لوگ ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزمائی کرتے اور فاتح آس پاس کی آبادیوں پر ایک طرح کی بادشاہت جما لیتا: تاآنکہ کوئی دوسرا نوبل اسے قتل کر دے یا بھگا دے۔ ایسے حکمرانوں کو مستبد حکمراں (TYRANT) کہا جاتا تھا اور چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کے دور میں یونانی شہروں پر ایسے ہی جابر لوگ مسلط تھے۔ خود ایتھنز بھی اس مصیبت کا شکار رہا۔ بالآخر جب یہ حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے تو اصلاح کے لیے نئی راہ نکالی گئی جو یونانیوں کو شہری جمہوریت تک لے گئی۔ لوگوں میں ایک قانون یا دستور کی طلب پیدا ہوئی جسے پورا کرنے کے لیے پہلا شخص ڈریکو (DRACO) آگے

بڑھا مگر اس کے قوانین اتنے سخت تھے کہ انہیں قبولیتِ عام حاصل نہ ہو سکی اب ایک دوسری شخصیت میدان میں آتی ہے جس کا نام آج تک معروف ہے۔ یعنی حکیم سولن (SOLON) اور حکیم سولن کا قانون ایتھنز میں نافذ ہوا۔ سولن نے ایک طرف نوبل طبقے کے مفادات کو محفوظ رہنے دیا اور دوسری طرف غربا کی بہتری کی قدرے گنجائش نکالی۔ اس کے قانون کے دو جمہوری اجزا بڑی اہمیت رکھتے ہیں:۔

۱۔ ہر شہری (محنت کار غلام اور تمام غیر ملکی شہریت کے حق سے یونان میں ہمیشہ محروم رکھے گئے) کے لیے شہر کے معاملات میں براہِ راست ذاتی دلچسپی لینا اور آبادی کی مجلس میں حصہ لینا لازم تھا۔

۲۔ ہر شہری کو اپنی شکایات ۴۰۱ افراد کی ایک مجلس کے سامنے لے جانے کا پورا حق تھا۔

بعد میں ایک اور شخصیت لائی کرگس بھی ایسی سامنے آتی ہے جس نے جذبۂ اصلاح کے تحت اسپارٹا کے لیے ایک بہتر نظامِ قانون وضع کرنے کا تہیہ کیا اور اس مقصد کے لیے سفر کر کے مختلف نظاموں کا مطالعہ کیا۔ ہم اس کا ذکر بعد میں کریں گے۔ یوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانی دماغ ایک صحیح نظام کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے اور نظریات سے فلسفہ کا دامن مالا مال ہو گیا لیکن الٰہی ہدایت کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ایک نظامِ عدل کبھی بھی پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ دورِ جاہلی کا مکہ بہ حیثیت ایک شہری ریاست کے ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں سے بدرجہا بہتر منظم تر اور آزاد تر نظام کا حامل تھا اور مکہ کی جمہوریت زیادہ درخشاں تھی۔ مگر اسلامی انقلاب اتنی بڑی چیز تھا کہ مکہ کی شہری ریاست اس کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ بہرحال آیئے یونان کی شہری ریاست کا بہترین نمونہ اسپارٹا میں ملاحظہ کیجیے۔ نظامِ عمل کے اہم نکات یہ تھے:۔

(۱) دو مختلف خاندانوں سے دو بادشاہ بیک وقت ہوتے تھے اور ان کا حق

فرماں رواتی موروثی خطوط پر چلتا تھا۔ دونوں میں سے کوئی ایک جنگ میں کمانڈ کرتا تھا۔ زمانۂ امن میں ان کے اختیارات محدود ہوتے تھے۔ اجتماعی ضیافتوں میں ان کو دگنا کھانا ملتا تھا۔

(۲) ایک مجلسِ اکابر ہوتی تھی جس میں دونوں بادشاہوں کے علاوہ ۳۰ افراد (۶۰ سال سے زائد عمر کے) شہریوں سے چُنے جاتے اور وہ بالعموم اونچے خاندانوں سے لیے جاتے تھے۔ یہ لوگ تاحینِ حیات منصب پر رہتے۔ یہ مجلس فوجداری مقدمات سنتی تھی اور شہریوں کی مجلس عام کے سامنے لانے کے لیے مسائل کو تیار کرتی۔

(۳) شہریوں کی مجلسِ عام جب تک کسی قانون یا فیصلے کو منظوری نہ دے وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مگر مجلسِ عام بطورِ خود کوئی تحریک نہیں کرتی تھی (یہ کام مجلسِ اکابر کا تھا) یہ صرف "ہاں" یا "نہ" کی صورت میں رائے دیتی تھی۔ مجلسِ عام کی منظوری اگرچہ ضروری تھی مگر فیصلوں اور اقدامات کے لیے کافی نہ تھی، کیونکہ لازمی یہ بھی تھا کہ اکابر اور مجسٹریٹ فیصلوں کی توثیق کریں۔

(۴) ایک چوتھا ادارہ حکومت بھی تھا جو پانچ نگرانوں (EPHORS) پر مشتمل تھا اور یہ لوگ مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ ان پانچوں کا انتخاب مجلسِ عام سے بذریعہ قرعہ اندازی ہوتا تھا۔ یہ ادارہ اسپارٹا کے دستور میں جمہوریت کا ایک اہم عنصر تھا۔ یہ "پنچایت" ایک طرف سپریم کورٹ کی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف بادشاہوں پر نگراں تھی۔ ہر مہینے بادشاہ دستور کے تحفظ کا حلف لیتے تھے اور پانچوں نگران یہ حلف لیتے تھے کہ وہ بادشاہوں کو اس وقت تک قائم رکھیں گے جب تک وہ اپنے حلف کے پابند رہیں۔ کوئی بادشاہ جب جنگ کے لیے نکلتا تو دو نگران ساتھ جاتے۔ یہ پنچایت بادشاہوں کے خلاف فوجداری کارروائی تک کر سکتی تھی۔ اوپر حکیم سولن کے نظام میں ۱۳ افراد پر مشتمل ایک جیوری کا تذکرہ ہم کر ہی چکے ہیں۔ جو ایتھنز کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

اس دستوری نقشے میں جمہوریت کا سب سے بڑا پہلو یہ تھا کہ شہر کی ساری آبادی نظامِ حکومت میں براہِ راست حصہ دار تھی۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ فرماں روا دستور و قانون سے بالاتر

اور ناقابلِ عزل نہ تھے۔ دوسری طرف تضاد اتنا تھا کہ غلاموں، محنت کاروں، اور غیر ملکی آبادی کو شہریت سے محروم قرار دیا گیا تھا۔ آبادی کو مستقلاً سیاست کار اور جنگ جو شہریوں اور کاشت کاروں اور پیشہ وروں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا اور یہ طبقاتی تقسیم موروثی طور پر آگے چلتی تھی۔ علاوہ بریں جہاں تک فرد کی آزادی کا معاملہ ہے، اسپارٹا کی جمہوریت اس پہلو سے کسی فاشستی نازی یا کمیونسٹ حکومت سے بہتر نہ تھی۔ آزادی اجتماعی حیثیت کے لیے تھی، افراد کے لیے نہیں۔ کوئی شخص اپنی پسند کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتا تھا بلکہ کیمپ کی سی منظم زندگی کا وہ پابند تھا۔ اسپارٹیوں کو ناگزیر صورتوں کے بغیر سفر تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔

مناسب ہوگا کہ ہم اسپارٹا کے نظام کا جائزہ اخلاقی حیثیت سے بھی لیتے چلیں۔ ہیروڈوٹس جسے اسپارٹا کے دورِ عظمت کے سایے میں رہنے کا موقع ملا، کہتا ہے کہ ایک اسپارٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ رشوت کی پیش کش پر اپنا ضمیر بچا سکے جنسی لحاظ سے بگاڑ اتنا تھا کہ منتخب بادشاہوں کو بسا اوقات اس بنیاد پر برطرف کر دیا گیا کہ وہ ولد الحرام تھے۔ ارسطو تک نے اپنے ناقدانہ جائزے میں کہا ہے کہ نگران (EPHORS) غریبی کی وجہ سے بآسانی رشوت کا شکار ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ان کا اختیار بادشاہوں سے بالاتر تھا۔ یہ لوگ دستور کے منشا کے خلاف زیادہ مزے کی زندگیاں گزارتے تھے۔ عام شہری پابندیوں کا بوجھ زیادہ ہونے کی وجہ سے خفیہ اور غیر قانونی طریقوں سے اپنی خواہشات پوری کرتے تھے۔ یونان کی افسانوی تاریخ کے دفاتر میں سے اگر لائی کرگس اور پلوٹارچ (PLUTARCH) کا آئنہ افکار اٹھا کے اسپارٹا کا عکس دیکھیں تو لڑکیاں نوجوان لڑکوں کے سامنے اور ساتھ لباس سے آزاد ہو کر کھیلتی، جسمانی مشق کرتی اور ناچتی دکھائی دیتی ہیں، ہر دیانت دار مرد کو قانوناً آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی منکوحہ سے ملوث ہو بچے کسی فرد واحد کے نہیں بلکہ معاشرہ کی ملکیت ہیں اور ناقص الخلقت بچوں کو پانی میں ڈبو کر ختم کر دیا جاتا ہے اور سات برس کی

عمر میں وہ گھروں سے اقامتی درسگاہوں میں منتقل کر لیے جاتے ہیں۔ انہیں ہوشیار بننے کے لیے چوری کرنا سکھایا جاتا تھا مگر پکڑے جانے پر اس نالائقی کی سزا دی جاتی تھی کہ وہ پکڑے کیوں گئے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہم جنسی محبت کرنا تسلیم شدہ اور مروج ضابطہ تھا۔ اخلاقی فساد کی یہی رو فی الحقیقت یونانی تمدن کی تباہی کا باعث بنی۔

یہ تھی یونان کی وہ جمہوریت جس کا یورپ میں خوب ڈنکا بجایا جاتا رہا۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شہری نظام حکومت میں جمہوریت کا عنصر موجود ضرور تھا اور اسی کو یونان کے دورِ آخر کے فلسفہ نے اپنے ساتھ لے کر نظری حیثیت سے مزید نشو و نما دی اور پھر یونانی فلسفیوں کے سیاسی نظریات جدید سیاسی تفکر کا نقطۂ آغاز بنے۔

(ق)

اسلام کے پردے میں الحاد

(شیخ ابو زہرہ پروفیسر قانون اسلامی قاہرہ یونیورسٹی، مصر

[محترم مقالہ نگار شیخ ابوزہرہ کا خطاب مصر کے متجدّدین کی طرف ہے مصر کے متجدّدین بعض دوسرے اسلامی ممالک کے متجدّدین سے مختلف نہیں ہیں بلکہ دو چار قدم آگے ہیں۔ وہاں اس گروہ کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن حکّام کی سرپرستی ہونے کی وجہ سے ان کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ہر طرح کے وسائل و ذرائع مہیّا ہیں۔ مُترفین کا طبقہ اور وہاں کا فحش نگار اور فسق پرور پریس ان کی خوب پیٹھ ٹھونک رہا ہے۔ ان حضرات کا فتویٰ ہے کہ سود حلال ہے، ملکی معیشت اس کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتی" تنظیم النسل" مُباح ہے۔ رقص جائز ہے، رقّاصہ عورتوں کا عُریاں لباس قابلِ اعتراض نہیں ہے کیونکہ لباس نے زمانہ کے ساتھ ترقی کی ہے اور دین بھی ترقی پذیر ہے اس لیے ایسی عورتوں کے لباس کو اگر" لباسِ شرعی" کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا مرد و زن کے عام اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ " وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (اور تم عورتیں اپنے گھروں میں قرار سے رہو) میں "بیوت" سے مراد گھر نہیں ہے بلکہ سوسائٹی ہے۔ مرد کو عورت کا قوّام بنانا استعمار پرستانہ نظریہ ہے۔ قومی ضرورت کے پیش نظر روزہ ترک کیا جا سکتا ہے۔ شراب نوشی جائز بلکہ" کارِ ثواب" ہے۔ الغرض شریعت کا کوئی شعبہ خواہ وہ شخصی قوانین سے تعلق رکھتا ہو یا عبادات و معاملات سے اس گروہ کا نشانۂ تحریف و تنسیخ بننے سے محفوظ نہیں رہا۔

یہ مسندِ افتاء پر متمکن ہونے والے حضرات صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں بیگمات کی ایک جماعت بھی شامل ہے جو مصلحت اور تقاضاتے حالات کی

اوٹ میں دین کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ دین سے ان کو جو کچھ دلچسپی ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے فراعنہ کے اسٹیچو نصب کیے جاتے ہیں اور ملحد شاعروں کی برسیاں منائی جاتی ہیں جن میں یہ خود ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں لیکن ابن تیمیہؒ کی برسی منانے کی تجویز جب سامنے آتی ہے تو طرح طرح کے اعتراض وارد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

مصر کے جدید نظام میں شہری اور دیہاتی علاقوں کی یونین کونسلیں بن چکی ہیں جن کے ہاتھ میں نہ صرف لوگوں کے نکاح و طلاق کے اختیارات ہیں بلکہ سماجی اصلاح کے فرائض بھی انہی کے کندھوں پر ہیں۔ ان نئے چودھریوں نے سماجی اصلاح کا جو راستہ اختیار کر رکھا ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ علاقہ سوہاج کے محافظ (ڈویژنل آفیسر) نے سوہاج کی "نیشنل یونین کونسل" کی انتظامیہ کی میٹنگ میں شرکت کی اور انتظامیہ کے ارکان کو توجہ دلائی کہ "سوہاج میں ابھی تک بعض خواتین پردے پر کاربند ہیں، ان عورتوں کو ترکِ پردہ کی دعوت دی جائے تاکہ یہ بھی قافلۂ ترقی کا ساتھ دے سکیں۔" (روزنامہ الجمہوریہ)

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ الحمد للہ مصر کے مسلمان عوام اور علماء کی کثیر جماعت "متجددین" اور "مُصلحین" کی ان حرکات سے نہ صرف بیزار ہے بلکہ سختی کے ساتھ ان کا نوٹس لے رہی ہے اور ان کی خرافات کو اٹھا کر ان کے منہ پر مار رہی ہے۔ چنانچہ جب کبھی وہاں کے "روشن خیال مفکرین" نے سُود، عائلی معاملات، اجتہاد و قانون سازی کے اختیارات اور اسی قبیل کے دیگر مسائل کے متعلق احکامِ شریعت کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اُسی وقت علماء حق کی کثیر تعداد نے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی صورت میں بھی اسلام کے صحیح احکام کو پیش کر کے حق اور باطل کے درمیان امتیاز قائم کر دیا ہے۔ شیخ ابو زہرہ کا مندرجہ ذیل مضمون جسے

ہم نے قاہرہ کے مشہور ماہنامہ "لواء اسلام" سے لیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے — خ ح]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

ترکت فیکم ما ان اخذ تم به لن تضلوا بعدی أبداً، کتاب اللہ و سنتی۔

مَیں تمہارے اندر دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے ان کو پکڑ لیا تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری سنت۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ، فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (نساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ

اے نبی، تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے

اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (نساء: ۶۰)

کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا، شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۔ (نساء: ۶۵)

پس نہیں (اے محمدؐ) تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو اپنا حَکَم نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

قرآن اور سنت کے یہ صریح احکام بتا رہے ہیں کہ ایمان اور کفر کے درمیان جو چیز امتیاز قائم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول جو ہدایت لے کر آیا ہے اُس کو سچا تسلیم کیا جائے، اُس کے آگے جھکا جائے، اور یہ یقین کر لیا جائے کہ اتباعِ رسول ہی میں انسان کی مصلحت ہے۔ قرآن کریم نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر بلا جھجک کاربند ہو جانا چاہیے اور جن کاموں سے منع کیا ہے اُن سے بلا تامل دستبردار ہو جانا چاہیے۔ کسی مومن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اُس کے لیے جو راستہ تجویز کیا ہو اُس سے رُوگردانی کر کے اپنی مرضی سے کوئی دوسرا راستہ منتخب کر لے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۔ (احزاب: ۳۶)

اور کسی ایمان دار مرد اور ایماندار عورت کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے لیے کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنے معاملے میں اپنا اختیار چلائیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔

بکثرت صحیح احادیث میں یہ حکم وارد ہے کہ خدا و رسول کے احکام سے ہٹ کر جو چیز لائی جاتے اُسے فوراً لانے والے کے مُنہ پر مار دینا چاہیے۔

خدا اور رسول کے قطعی احکام اور شریعت کی واضح حدود سے جو شخص تجاوز کرتا ہے وہ گمراہ اور بھٹکا ہوا ہے۔ اور جو ان پر قائم رہتا ہے وہ ایسی شاہراہ پر گامزن ہے جس میں کوئی خم و پیچ نہیں ہے، نہ بہکنے اور بھٹکنے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ فساد فی الارض کا احتمال ہے لیکن قرآن و سنت کی اس حکیمانہ تعلیم اور محکم نظام کے باوجود مسلمان قوم کے اندر ایک ایسا گروہ نمودار ہو گیا ہے جو اسلام سے ناک بھوں چڑھا رہا ہے۔ اللہ کے کلام کو فضول سمجھتا ہے اور شریعت کے احکام کو متروک ٹھہراتا ہے۔ بلکہ اس گروہ کے بعض افراد تو بڑی بے شرمی کے ساتھ احکام شریعت کو تمسخر اور استہزاء کا نشانہ بنا رہے ہیں چنانچہ ایک قانون دان سے وراثت کے ایک مقدمہ میں جب یہ دریافت کیا گیا کہ کیا اس میں شرعی احکام کے مطابق فیصلہ کیا جاتے۔ تو وہ صاحب اس رائے کا مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگے: کیا آپ نہیں جانتے کہ مُلّا کہتا ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوتا ہے) —— گویا ان کے نزدیک نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ بھی مُلّا ہے، کیونکہ یہ حکم اُسی نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے:

اس گروہ کے کچھ افراد وہ ہیں جو اسلام کی مضبوط اور مستحکم رسی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے خاص منصوبہ اور تدریج کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی زبانیں بکثرت "زمانہ کے حالات" اور "مصلحت کے تقاضوں" کے الفاظ دُہراتی رہتی ہیں۔ یہ بار بار کہتے ہیں کہ اسلام کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ترقی کے راستہ کا پتھر بننے کے بجائے زمانہ کے ساتھ چلے۔ ان کا ارشاد ہے کہ اسلام کا اس وقت تک بول بالا نہیں ہو گا جب تک وہ زمان و مکان کے مطالبات کے سامنے نہیں جھکے گا۔ گویا ان لوگوں کی قاموس میں اسلام کی بالاتری کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ زمانہ —— نہ کہ اصحاب علم و بصیرت —— جس چیز کو اختیار کریں اسلام اُن کے آگے

سرنگوں ہو جاتے ہیں بعض اوقات یہ لوگ بڑی پوچ باتیں کرتے ہیں اور اپنے ادعائے دانشمندی کے باوجود ایسے بھونڈے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک ذی عقل انسان سن کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ ہنسی کیا ہے، ماتم ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ پہلے منکرات اور افعالِ قبیحہ کو رواج دیتے ہیں اور پھر احکامِ الٰہی کو انہی کے تابع کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ اسلام غسل کے وقت سر کے بالوں کو دھونے کی شرط کیوں عائد کرتا ہے۔ یہ شرط ان عورتوں کے لیے موجبِ حرج و تنگی ہے جو ہیرڈریسر سے بال بنواتی ہیں۔ پھر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ چونکہ یہ شرط ایسی عورتوں کو غسل کے تمام احکام سے بیزار کر دے گی اس لیے اولیٰ یہ ہے کہ غسل میں سر پر صرف مسح کو کافی سمجھا جائے۔ اور جب ہم اُن سے گزارش کرتے ہیں کہ غسل میں سر کا دھونا واجب ہے تو ارشاد ہوتا کہ یہ بیگمات بالوں کی تراش خراش پر جو رقم خرچ کرتی ہیں کیا اس پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟ اس طرح تو دین میں تنگی پیدا ہو گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (اُس نے تم پر دین کے معاملے میں تنگی روا نہیں رکھی)، لیکن ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ آخر عورت کو سر دھونے کے لیے کتنے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ کیا وہ مہینوں اسے بلا دھوئے رکھے گی؟ اور پھر مسلمانوں کے شہروں اور بستیوں میں اس نوعیت کی عورتوں کی کتنی تعداد ہے؟ کیا مسلمان قوم کے اندر ایسی عورتوں کا تناسب شاذ و نادر کے حکم میں نہیں ہے؟ محلات کو چھوڑ کر عام شہری آبادی کے اندر ان کی تعداد ایک فی ہزار سے متجاوز نہیں ہے۔ دیہاتی آبادی میں تو یہ تناسب اور بھی گھٹ جاتا ہے۔ کیا ان گنتی کی چند بیگمات کی خاطر ہم اپنے پروردگار کی شریعت کو تبدیل کر دیں اور اپنے نبی کی سنت کو ساقط کر دیں اور ثابت شدہ حقائق کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیں؟ چند افراد کے انحراف سے شریعت کی تبدیلی تو کجا خود ان منحرفین کی سرکوبی لازم آتی ہے کیونکہ یہ فطرتِ انسانی سے بغاوت کر رہے ہیں اور اس کے حسین چہرے پر سیاہی لیپ رہے ہیں

اس ایک چھوٹی سی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ احکام دین کا قلادہ گلے سے اُتارنے کے لیے کیا کیا حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں اور کس طرح دین کو اپنی خواہشات کا غلام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: لا یومن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کی خواہش میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائے)

علیٰ ہذا القیاس اس گروہ کے لوگ نفس کی آگ بجھانے کے لیے اہل یورپ کی نقالی میں پہلے تو خود ہی ایک بدعت قائم کرتے ہیں، پھر اُسے واجب الاتباع شریعت کا رنگ دینے کے لیے کتاب و سنت کے ثابت شدہ احکام میں تحریف کے درپے ہو جاتے ہیں اور مصلحتِ وقت کی آڑ لے کر ناقابلِ تردید حق کو اپنے نفس کے احکام کے آگے جھکا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہو جاتا تو آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان کے اندر ہے ان میں فساد رونما ہو چکا ہوتا۔ مومنون: ۷۱)

شریعت انسانوں پر حاکم بن کر آتی ہے اور یہ اُس نظام کی دعوت دیتی ہے جو اپنی فطرت میں افضل و اولیٰ نظام ہے اور قانونِ اخلاق کی طرح حکم عام رکھتا ہے جسے خاص اور محدود نہیں کیا جاسکتا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ انسانی اخلاقِ فاضلہ کے کسی قانون کو کسی ایک شخص کی خواہش کی بنا پر یا کسی نئے فعل یا نئے رواج کی پیروی کے لیے تغیر کا نشانہ بنایا گیا ہو اگرچہ وہ فعل یا رواج تقلید پر مبنی نہ ہو بلکہ خود ساختہ ہو؟ لیکن مغرب کی یہ کورانہ تقلید جس میں ہم غرق ہو رہے ہیں اور جس کی پشت پر تفکر و تدبر کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ یہ بذات خود ایک قومی اور اجتماعی آفت ہے اور اس کا ازالہ ناگزیر ہے۔ کسی چیز کے ترک و قبول میں اُس کے اچھے یا بُرے پہلو کا جائزہ لیے بغیر اندھا دھند کسی

قوم کی تقلید کرنا عقلی تعطل کا باعث ہوتا ہے۔ اور عملی زندگی میں جب عقلی تعطل اور فکری اضمحلال رونما ہو جاتا ہے تو لازماً نفسِ انسانی میں فساد اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے قوم کا اجتماعی توازن بگڑ جاتا ہے اور معاشرتی بیماریوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے اگر اسلام ہر تقلید کے آگے سپر انداز ہو جاتا تو اُس کی دعوت کو کبھی ثبات حاصل نہ ہوتا اور اُس کے کلمے کو وہ سربلندی اور وسعت نصیب نہ ہوتی جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ قرآن کی زبان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں مشرکین جو حجت پیش کرتے تھے وہ اُسی طرز کی حجت تھی جو عصرِ حاضر کے "عقلاء" پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ - وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ -

(البقرہ ۱۷۰-۱۷۱)

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے اُس کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے، اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو (تو کیا پھر بھی انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے)۔ یہ لوگ جنہوں نے (خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے) انکار کر دیا ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

بعینہٖ یہی روش ان لوگوں کی ہے جو اہلِ مغرب کی نقالی پر اترے ہوئے ہیں۔ یہ کیسی

چیز کو اختیار کرتے وقت اُس کے حسن و قبح کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ تقلید کی رو میں بالکل بے دست و پا ہو کر بہے جا رہے ہیں۔ ان میں اور اہلِ جاہلیت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ اہلِ جاہلیت کی تقلیدِ آباد کی منطق یہ تھی کہ بیٹے بزرگوں کے وارث ہوتے ہیں، بزرگوں کے افکار و عادات ان میں سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن خیالات پر ان کی تربیت اور نشو و نما ہوئی ہوتی ہے اُس میں تغیر و تبدل کے بارے میں سوچنا مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن عہدِ حاضر کے مقلدین کا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ ان کی نشو و نما کسی قدر اسلام کے ماحول میں ہوئی ہے، لیکن یہ اسلام سے خروج کر چکے ہیں، مغرب کی پُرفریب تہذیب کی لذتوں نے ان کو رام کر لیا ہے اور یہ بلا دلیل و حجت اور بلا تشخیص و تمیز اُس کی پیروی کر رہے ہیں۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ جن فاسد نظریات کو انہوں نے اپنے لیے منتخب کر لیا ہے انہیں اسلام کی پشت پر لاد دیں۔ یہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بالکل صحیح صادق آتا ہے:

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۔ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۔ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۔ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔	یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں

پڑے ہوئے ہیں یا ان کو خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (النور: ۴۷-۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں۔

گنتی کے چند لوگوں کی خواہشوں پر احکامِ الٰہی کو ترک کر دینے والے حضرات ہمیشہ مصلحت کے نام پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ "حقیقی مصلحت" وہی ہے جس کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ نفس کی خواہشوں کو مصلحت کا لباس پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ حضرات حقائق پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مصلحتِ انسانی پر کیا ستم ہوگا کہ خواہشاتِ نفس کو حقیقی مصالح کا نام دے دیا جائے۔ اور اصل مصلحت کو گمنامی کی نذر کر دیا جائے۔ یہ لوگ شتر بے مہار ہیں جن کو کوئی اخلاقی بندھن، کوئی دینی ضابطہ، کوئی شریفانہ رواج اور کوئی بھلی روایت دائرہ انضباط میں نہیں لا سکتی۔ ان کی آرزو یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کے ساتھ کھیلیں اور اُسے اپنے محبوب اور مرغوب سانچوں میں ڈھالتے رہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی ایسے لوگ تھے۔ ایک مرتبہ ان کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں سردی سخت پڑتی ہے، اور لوگ شراب پی کر جسمانی حرارت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا: اُقْتُلُوْهُمْ (ایسے لوگوں کی گردن مار دو)۔ پس جو لوگ اپنی خواہشات کے ہاتھ

میں گرفتار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشات حاکم اور شریعتِ الٰہی محکوم ہو۔ وہ اُن کج فطرت اور فتنہ جُو لوگوں کی صف میں شامل ہیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کا فرمان صادر فرمایا تھا۔ کیونکہ ان کی قانون شکنی سے دوسرے لوگ بھی ضعفِ ایمانی کا شکار ہوں گے اور نتیجۃً فسق و فجور علانیہ ہونے لگے گا اور اتباعِ ہوا کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے یہ نصیحت فرمائی ہے مگر اس کا رُخ ہر صادق الایمان مومن کی طرف ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۔ إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۔ (جاثیہ ۱۸-۱۹)

پھر ہم نے تم کو دین کے راستہ پر چلایا ہے۔ پس تم اسی کی پیروی کرو اور نادانوں کی خواہشوں پر نہ چلو، وہ اللہ کے سامنے ہرگز تمہارے کام نہ آئیں گے۔ بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا رفیق ہے۔

یہ حضرات دعوت تو دیتے ہیں ہوا پرستی اور بندگیٔ نفس کی، مگر سمجھتے یہ ہیں کہ وہ "مصلحتِ قومی" کے علمبردار ہیں۔ حالانکہ حقیقی مصلحت ان کی رائے کے یکسر خلاف ہے اور عقلِ سلیم ان کی دعوت سے صاف ابا کرتی ہے۔ ہوا پرستی کے ہاتھ میں جب فیصلوں کی زمامِ کار آجاتی ہے تو وہ عقل پر غالب آجاتی ہے اور عقل اس کی بندۂ بے دام بن کر رہ جاتی ہے۔ اسلام جن مصالح کو قابلِ اعتبار سمجھتا ہے وہ بالکل واضح ہیں فقہائے اسلام نے ــــ جن کا نام سنتے ہی یہ حضرات اپنا سر مٹکانے لگتے ہیں ــــ ان مصالح کو جامعیت کے ساتھ منضبط کر دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ شرعی مصلحت انسان کی جان، مال، نسل، عقل اور دین کی حفاظت کا نام ہے لیکن گروہِ منحرفین انہی تمام شرعی مصلحتوں پر خود "مصلحت" کے نام سے حملہ آور ہوتا ہے

یہ لوگ شراب نوشی اور فسق و فجور کو مصلحتوں کے نام لے لے کر ہی رواج دے رہے ہیں۔ کیا یہ عقل انسانی اور نسل بشری پر غارتگری نہیں ہے؟ اسی طرح سے یہ ربا کی ہر مقدار کو خواہ کم ہو یا زیادہ حلال و طیب قرار دے رہے ہیں اور اکل الاموال بالباطل کا کوئی ایسا دروازہ نہیں ہے جس میں یہ داخل نہ ہو رہے ہوں۔ کیا یہ انسانی مال کی ظالمانہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہے؟ پھر یہ لوگ الحاد و زندقہ اور دین سے بغاوت کی کھلم کھلا تشہیر کر رہے ہیں۔ اسلام کی بنیادی حقیقتوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ اسلام کے کسی ایک شعار کو بھی یہ باوقار نہیں دیکھنا چاہتے۔ دین کی علانیہ بے حرمتی کرتے میں محرمات کا آشکارا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک شخص بھری مجلس میں اٹھتا ہے اور منہ پھٹ ہو کر اسلامی حقائق و اقدار کو کھوکھلا اور بے بنیاد ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کے ہر "مفکر" کے لیے اسلام ایک خوانِ یغما بنا ہوا ہے۔ ان منحرفین کی سوسائٹی میں یہ عام مشہور ہے کہ جو شخص بھی ناموری حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ادیانِ سماوی اور بالخصوص اسلام پر نکتہ چینی اور طعن و تشنیع شروع کر دے کیا یہ ملتِ مسلمہ کی بیخ کنی نہیں ہے؟ دین و ایمان کی چولیں ڈھیلی ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا ٹھکانا کہاں ہے؟ کیا واقعی "مصلحت" یہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک بے یقین، بے سیرت اور بد اخلاق قوم بنا ڈالا جائے؟

اسلام کا ہر حکم بذاتِ خود ایک مصلحت ہے اور اس کی مخالفت بذاتِ خود ایک مضرّت۔ جو شخص اسلام کے حکم قطعی سے ہٹ کر مصلحت تلاش کرتا ہے، وہ ضلالِ بعید میں مبتلا ہے۔ عرب عصرِ حاضر کے منحرفین سے زیادہ مصلحت شناس تھے۔ ایک بدوی سے پوچھا گیا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں ایمان لاتے ہو؟ اس نے جواب دیا: "ما رأیتُ محمداً یقول فی امر: اِفعل، والعقل یقول لا تفعل" وما رأیتُ محمداً یقول فی امر: لا تفعل والعقل یقول: "افعل" (میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ محمدؐ نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو اور عقل نے کہا ہو: "نہ کر"۔ یا محمدؐ نے کسی کام سے روکا ہو اور عقل نے کہا ہو: "کر")۔ بے شک

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مہمل نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُسے صراحت سے بتا دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمراہی کیا ہے، مصلحت کیا ہے اور مضرت کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ ارشاد باری ہے: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اُس کو یونہی مُہمل چھوڑ دیا جائے گا (قیامہ: ۳۶)۔

شریعتِ الٰہی ہی تمام انسانی امراض کی شفاء ہے اور معاشرے کی تمام خرابیوں کا علاج ہے۔ یہ انحراف، جو نوجوانوں کو لپیٹ میں لے رہا ہے، یہ فحاشی جو محفلوں پر چھائی جا رہی ہے اور یہ بدعات جن کے پیچھے عورت روز بروز دوڑی جا رہی ہے، ان سب کی دوا شریعت کے سوا کہیں نہیں ملے گی اور ان سے نجات کی جگہ دین کی شہر پناہ کے سوا کہیں حاصل نہ ہو گی۔ اس وقت بگاڑ معاشرے کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے، حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ٹیلیویژن پر عالمی پروگرام پیش کیا جاتا ہے تو اس میں مناظرِ فطرت اور صنعتی ترقی اور تہذیبی مظاہر دکھانے کے بجائے عورتوں کی چوٹیوں کے مختلف مناظر، زنانہ پوشاکوں اور پازیبوں کے رنگا رنگ نمونے دکھائے جاتے ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ کل کی نسبت آج ان میں کیا تبدیلی آگئی ہے۔ کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ یہی ثقافت گزیدہ لوگ ہمارے پاس آکر کہتے ہیں کہ اسلام کو برتر مقام سے نیچے اتارو تاکہ وہ موجودہ حالات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس انحراف کو بیماری کی علامت سمجھ کر اسلام کو ذریعۂ علاج بناتے اور حکومت سے اس کے انسداد کی مدد حاصل کرتے، یہ اس کی مزید حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اُلٹا اسلام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے احکام تبدیل کرے کیونکہ اسی میں مصلحت ہے۔

ایک شخص جس کی عملی زندگی فسق و فجور سے ملوث ہوتی ہے، اٹھ کر اسلام پر اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیتا ہے، اور جب اُسے ٹوکا جاتا ہے تو "مفکرین" کی ایک فوج جو اس کی ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتی ہے یہ فتویٰ دینا شروع کر دیتی ہے کہ "وہ جیع چیز کو لوگوں پر

محدود اور تنگ نہ کرو، دین میں آسانی ہے، دشواری نہیں ہے" یہ الفاظ ان "منکرین" کو خوب از بر ہوتے ہیں۔ تاکہ اسلام ہی کی چیزوں کو اسلام کے خلاف استعمال کرکے فساق و مُترفین کو خوش کرسکیں اور ان کا تقرب حاصل کرسکیں۔ مگر درحقیقت یہ اسلام پر بدبختی مسلط کرتے ہیں، اسلام کے چہرے کو سیاہ کرتے ہیں اور اسلام کی ہیبت و شوکت کو لوگوں کے دلوں سے مٹاتے ہیں۔

آپ حضرات تک یقیناً یہ خبر پہنچی کہ ایک رقاص نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام رقص و سرود کو مباح قرار دیتا ہے، اور اس کے حلقہ تقرب میں شامل ماہرین اسلام نے اس رائے کی تائید کی ہے۔ کاش یہ "ماہرین اسلام" اس منکر پر کم از کم خاموش ہی رہتے اور اس کی ہمت افزائی نہ کرتے۔ مگر چونکہ ان کے نزدیک ایسے موقع پر خاموشی "کتمانِ علم" ہے جو "سخت گناہ" ہے، اس لیے وہ سخن طراز ہوئے اور رقص کو مُباح ثابت کردیا۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ اس کا اعلان نہیں کیا لیکن اگر وہ یہ بھی کردیتے تو "مجددِ اسلام" اور "روشن خیال عالم" کے خطابات اور درجہ اوّل کے تمغے ان کے لیے حاضر تھے۔

اس وقت اسلام جس آزمائش میں مبتلا ہے، ماضی میں اس نے یہ آزمائش کبھی نہیں دیکھی جتنی کہ تاریک ترین ادوار میں بھی وہ ایسے حالات سے نہیں گزرا۔ عباسی عہد میں زنادقہ کے ہاتھوں اسلام پر آزمائش نازل ہوئی، صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسلمان اپنی ہی سرزمین میں مبتلائے فتنہ ہوئے، تاتاریوں کی یورش اسلام نے سہی، اور آخر میں استعماری دور، جو صلیبی جنگوں کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی، اسلام کے لیے آزمائش کا پیغام لے کر آیا لیکن اسلام صحیح و سلامت باقی رہا، اللہ کی کتاب حفظ و تواتر کی بدولت باقی رہی، بلکہ حفظ و تواتر میں اضافہ ہوا، سنت زندہ رہی، علماء کے حلقہ ہائے درس اس کی روایت و درایت میں مشغول رہے، اور فسادِ امت کی یاس انگیز فضا میں کتاب و سنت سے سامان تسلی حاصل کرتے رہے، اجتہادی ادوار کا فقہی سرمایہ جو سلف سے منقول چلا آرہا تھا،

متقدّمین کی بدولت محفوظ رہا۔ بے شک اس دور کے علماء منقولات پر جامد رہے، کوئی تجدید و اضافہ انہوں نے نہیں کیا، لیکن اس جمود کا یہ فائدہ تو ہوا کہ انہوں نے ورثۂ اسلام کی نگرانی کی، قرآن پر پہرہ دیا، تحریف سے اُسے بچایا اور اس کی خانہ ساز تاویل کرنے والے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ان محافظین اور جامدین کو آپ جو کچھ چاہیں کہہ لیں مگر یہ تو مسلّم ہے کہ انہوں نے امانتِ اسلام کی نگرانی کا حق ادا کر دیا اور آنے والی نسلوں تک تبلیغ و انحراف سے پاک و محفوظ پہنچا دیا۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہم میں سے ایک گروہ تو اپنے سابق بزرگوں کی طرح محض جمود پر قائم ہے، اور دوسرے گروہ نے "مجدّد" بننے کی ٹھان لی ہے۔ تجدید کے ان مدعیوں میں سے کوئی قرآن پر ہاتھ صاف کر رہا ہے، اس کی من مانی تفسیریں کر رہا ہے اور اسے مصلحتِ وقت کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کچھ لوگ سنّت پر حملے کر رہے ہیں، اور اس کے اکثر و بیشتر ذخیرے کو ساقط الاعتبار قرار دے رہے ہیں۔ کچھ حضرات نے اجماعِ امت ہی کو سرے سے ساقط کر دیا ہے۔ اور بعض ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کے نام تو مسلمانوں کے سے ہیں مگر اُن کا خیال ہے کہ ملّتِ اسلامی نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد سے لیکر آج تک نماز اور دوسرے ارکانِ اسلام کا صحیح مطلب ہی نہیں سمجھا۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا

ان حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح۔ تم لوگ دین کے خدّ و خال کو مسخ کرنے کا کام سرانجام نہ دو۔ خود فریبی کسی عقلمند کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اگر تم لوگ مسندِ فتویٰ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کم از کم اپنے خود ساختہ نظریات کو اللہ اور رسول کے سر نہ تھوپو، دین کو خواہشات کا کھلونا نہ بناؤ، کسی دنیا پرست کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی آخرت کو باطل کے عوض نہ بیچو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیشِ نظر رکھو کہ: ثلاث منجیات وثلاث مهلكات. فاما المنجيات فتقوى الله فى السر والعلن، وقول الحق فى الرضا والسخط، والصدق فى الغنى والفقر

واما المهلكات فهوى متبع، وشح مطاع، واعجاب المرء بنفسه وهى اشدهن۔
(تین خصلتیں انسان کو نجات دینے والی ہیں اور تین ہلاک کرنے والی۔ تین نجات دینے والی یہ ہیں: پوشیدہ و علانیہ اللہ سے ڈرنا، رضامندی و ناراضی دونوں حالتوں میں حق بات کہنا، تونگری و ناداری دونوں صورتوں میں سچائی پر کاربند رہنا۔ اور تین ہلاک کرنے والی خصلتیں یہ ہیں: خواہشات کی پیروی کرنا، بخل کا طریقہ اختیار کرنا اور خود پسندی میں مبتلا ہونا اور یہ سب سے مہلک ہے — بروایت بیہقی۔

حدیث کی تدوینِ جدید

[تدوین حدیث کے متعلق ذیل کی تفصیلات ماہنامہ حضارۃ الاسلام، دمشق اور ہفت روزہ المصور قاہرہ میں شائع ہوئی ہیں۔ ہم نے دونوں رسالوں کی تفصیلات کو ایک جگہ مرتب کر دیا ہے]

احادیث کی ترتیبِ جدید عصرِ حاضر کی شدید ترین ضرورت ہے۔ انفرادی طور پر تو اس میدان میں متعدد مساعی منظرِ عام پر آئی ہیں۔ مثلاً ازھری عالم شیخ منصور علی ناصف کی کتاب "التاج الجامع للاصول فی احادیث الرسول"، احمد عبدالرحمان البنّا کی الفتح الربانی جس میں انہوں نے مسند امام احمد بن حنبل کو بنیاد بنا کر احادیث کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا ہے۔ قدماء کے ہاں بھی بعض مجموعے ملتے ہیں۔ مثلاً امام بغوی کی المصابیح، ابن اثیر جزری کی جامع الاصول، ابن تیمیہ جدّ امجد امام ابن تیمیہ کی المنتقی وغیرہ۔ جہاں تک انفرادی کوششوں کا تعلق ہے، یہ سب مجموعے اپنی جگہ نہایت مفید اور بیش قیمت ہیں، اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کام کی عظمت و وسعت کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اہلِ علم کی ایک جماعت عصری تقاضوں کے مطابق سرانجام دے۔

مصر کی وزارتِ اوقاف نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ عصری اسلوب کے مطابق حدیث کی تدوین کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اوقاف کے وزیر احمد عبداللہ طعیمہ نے اس کام کے لیے جن علماء کو منتخب کیا ہے اُن کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اس مہم کے بوجوہِ احسن پایۂ اختتام تک پہنچنے کی قوی امید بندھتی ہے۔ چنانچہ مدینہ بورڈ کے صدر، اسٹیٹ کونسل کے صدر سید علی السید ہیں، اور ارکان میں سے نمایاں حضرات یہ ہیں: شیخ ابوزہرہ پروفیسر

قانونِ اسلامی قاہرہ یونیورسٹی، مصطفیٰ سباعی صدر بورڈ آف فقہی انسائیکلوپیڈیا، مصطفیٰ زرقا
پروفیسر قانونِ اسلامی شریعت کالج دمشق، شیخ محمد بہجت البیطار، شام کے نامور سلفی
عالم اور عربک اکیڈیمی کے ورکنگ ممبر، ڈاکٹر ضیاء الدین رئیس پروفیسر تاریخ اسلامی قاہرہ
یونیورسٹی، محمد ناصر الدین البانی ماہرِ فنِ رجال، محمد منتصر الکتانی پروفیسر شریعت کالج دمشق
سید سابق مصنف فقہ السنّہ، محمد ابو شہبہ اور محمد الغزالی وغیرہم۔ صدر کے علاوہ بورڈ
کے ارکان کی کل تعداد ۲۹ ہے۔ ان میں چند حضرات جدید علوم کے ماہرین بھی ہیں۔

"حدیث بورڈ" کے ابتدائی اجلاس میں نقشۂ کار کی جو تفصیلات طے ہوئی ہیں اُن میں
یہ واضح کیا گیا ہے کہ بورڈ صحیح احادیث کی تبویب اور تشریح کرے گا تاکہ ان کی مدد سے مسائل
حیات میں سے ہر مسئلہ پر سنّت کی رہنمائی معلوم کی جا سکے۔ احادیث کی صحت و انتخاب کے
لیے قواعدِ ذیل پیشِ نظر رکھے جائیں گے:

اگر حدیث بخاری اور مسلم یا دونوں میں سے کسی ایک کے اندر موجود ہوگی تو اس کی
صحت مسلّم ہوگی۔ اگر سنن ترمذی میں ہوگی تو خود امام ترمذی نے اُس کے بارے میں جو رائے
قائم کی ہوگی اُسی پر اکتفا کیا جائے گا بشرطیکہ دوسرے حفاظِ حدیث کے اقوال اس سے معارض
نہ ہوں۔ سنن ابوداؤد کی ہر اس حدیث کو لیا جائے گا جس پر خود امام ابوداؤد نے اور حافظ
منذری نے سکوت کیا ہوگا اور دوسرے محدّثین کے اقوال بھی اُس کے معارض نہ ہوں گے۔
امام نسائی کی جو احادیث المجتبیٰ میں مذکور ہیں، ان میں سے ان احادیث کو منتخب کیا جائیگا
جن پر خود امام نسائی یا دوسرے کسی محدّث نے تعقیب نہ کی ہوگی۔ سنن ابن ماجہ کی منفرد
احادیث کو لینے کے لیے دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے گا، ایک یہ کہ اقوالِ محدّثین اُن
کے معارض نہ ہوں اور دوسرے سندھی کی تلخیص ——— جو سندھی نے زوائد بوصیری سے کی ہے
——— کی جانب رجوع کیا جائے گا۔ چنانچہ بورڈ نے وزارتِ اوقاف سے سفارش کی ہے
کہ وزارتِ اوقاف "زوائد بوصیری" کو شائع کرے اور اس سلسلے میں ان دونوں نسخوں کو پیشِ نظر رکھے،

جن میں سے ایک حلب میں اوقافِ اسلامیہ کی لائبریری میں اور دوسرا دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔

اب آخری خبر یہ ہے کہ "حدیث بورڈ" احادیث کی جمع و تبویب سے فارغ ہو گیا ہے اور اب سالِ رواں کے آخر میں قاہرہ میں ایک حدیث کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں دنیائے اسلام کے علماء اور ماہرینِ حدیث کو دعوت دی جائے گی اور متذکرہ بالا مجموعہ کے تمام پہلوؤں پر بحث و تمحیص کے بعد اُسے آخری شکل دی جائے گی۔ آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ "حدیث بورڈ" کا کام احادیث پر "نظرِ ثانی" نہیں ہے جیسا کہ بعض استعمار پرست خبر رساں ایجنسیوں نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کا کام صحاح ستّہ کی احادیث کو عصری اسلوب اور تقاضوں کے مطابق جامہ تدوین پہنانا ہے۔ تاکہ جدید مسائل کے بارے میں سنّت — جو بالاجماع شریعتِ اسلامی کا دوسرا مآخذ ہے — کی تعلیم کو سہل الحصول بنایا جا سکے۔ (خ - ح)

مطبوعات

تذکرہ سلیمانی | تالیف: جناب غلام محمد صاحب بی، اے عثمانیہ۔ ناشر: ادارہ مجلس علمی۔ کراچی۔ صفحات ۴۶۶۔ قیمت مجلد سات روپے آٹھ آنے۔

کسی شخصیت کی عظمت کو پرکھنے کے لیے عام طور پر پانچ اصول پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی ایسے آئیڈیل کی محبت میں سرشار ہو۔ جس سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہو۔ اس ضمن میں اگر وہ انسانوں سے محبت بھی کرے تو اُن سے مادی فوائد ولذائذ حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ اُن انسانوں میں اُس کے پسندیدہ اصول جلوہ گر ہیں۔ پھر آئیڈیل سے محبت بھی کسی وقتی جوش اور ہیجان کا نتیجہ نہ ہو بلکہ وہ سوچ سمجھ کر دل ودماغ کو اچھی طرح استعمال کرنے کے بعد اُس سے لگن پیدا کرے۔ اس کے علاوہ وہ جس نصب العین کو اپنانے کا دعویدار ہے اُس کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے وہ مسلسل اور پیہم جدوجہد بھی کرتا رہے۔ ان اصولوں پر جب ہم مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کو پرکھتے ہیں تو انہیں واقعی ایک عظیم الشان پاتے ہیں۔ خدا کے اس پاکباز بندے نے پوری زندگی کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کیا اور اس سلسلہ میں ایسے عظیم الشان کام سرانجام دیئے جنہیں مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے اسے مولانا مرحوم کی نیک بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس نیک اور مقدس کام پر مولانا شبلی کا اختتام ہوا اس سے علامہ سید سلیمان مرحوم نے آغاز کیا۔ یوں تو علم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس میں انہوں نے گوہر نہ لٹاتے ہوں، مگر حضور سرور کائنات کی حیاتِ طیبہ کو جس اچھے انداز میں انہوں نے قلم بند کیا ہے وہ اُن کا علمی شاہکار ہے۔ اور یہی خدمت تنہا انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی

اور علم و فضل میں اپنے استاد کے صحیح جانشین تھے۔ اُن کا قلم نرم رو اور نیک خرام تھا۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ کی بیعت کے بعد اُن کے مزاج میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

جناب غلام محمد صاحب پوری اُمت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس عظیم شخصیت کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا ہے، ان کے روحانی ارتقاء کی داستان بیان کی ہے اور اُن کے علمی کمالات کو بڑے اچھے اور دلنشیں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ پوری کتاب بڑی دلچسپ اور مفید ہے۔ تبصرہ نگار کو مطالعہ کے دوران میں البتہ ایک چیز ضرور کھٹکی ہے جس سے بعض مقامات پر احساس مجروح ہوتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا سید سلیمان (اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) دونوں دین کے مخلص خادم تھے۔ ان کی راستے سے تو اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کی نیت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کے آپس میں جو مخلصانہ تعلقات تھے انہیں دنیا جانتی ہے اس لیے ان کے عقیدتمندوں کو زبان یا قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکالنی چاہیے جس سے شکوک اور بدگمانیوں کو راہ پانے کا موقع ملے۔ صلہ پر ذیل کی عبارت کتاب کے عام مزاج سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

> "الہلال پر نام چونکہ مولانا آزاد کا ہوتا تھا اس لیے بہت سوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ الہلال کس کی کرامت سے بدرِ کامل بن گیا ہے مگر جب ایک سال کی رفاقت کے بعد بعض وجوہ سے یہ صاحبِ کرامت ہستی بے تعلق ہو گئی تو جو بدر تھا وہ ہلال بھی نہ رہ سکا۔ محاق بن گیا۔ مولانا آزاد گھبرا نے "

سید سلیمان ندوی چونکہ ایک مخلص خادم دین تھے اس لیے ہمیں یقین ہے کہ انہیں اپنے نام کے چھپنے یا نہ چھپنے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی ہو گی۔ ان باتوں کا خیال تو دنیا دار قسم کے لوگ رکھتے ہیں اور وہ ان چیزوں سے بہر حال بلند تھے۔ اس بنا پر مناسب یہی ہے

کہ اس قسم کی بحثوں کو اٹھا کر اب تلخیاں نہ پیدا کی جائیں۔

عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ از مولانا امین احسن اصلاحی صاحب۔ شائع کردہ: ملک برادرز تاجرانِ کتب، کارخانہ بازار، لائل پور۔ قیمت قسم اوّل۔ تین روپے۔ قسم دوم دو روپے ۲۵ نئے پیسے۔ صفحات ۱۶۸۔

زیر تبصرہ کتاب میں اُس عائلی کمیشن کی رپورٹ پر مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے جو پاکستان کی مرکزی حکومت نے ۱۹۵۵ء میں مسلمانوں کے عائلی مسائل و قوانین کا جائزہ لینے اور اُن کے بارے میں تجاویز و سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ اس فاضلانہ تصنیف کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک رپورٹ پر تبصرہ ہی نہیں بلکہ اسلام کے ازدواجی و عائلی مسائل پر ایک سیر حاصل بحث ہے۔ جس میں ان مسائل سے متعلق تمام نئے شبہات کا ازالہ کر دیا گیا ہے اور تمام پرانی بے اعتدالیوں کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا یہ تبصرہ بڑا جاندار اور فکر انگیز ہے۔ ہم اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

ماہنامہ "افکارِ نو" لاہور مدیر: پروفیسر محمد ارشد نعمان بھٹی۔ مقامِ اشاعت: ۲ بیگم روڈ لاہور۔ سالانہ چندہ چھ روپے فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے۔

اخلاقی اور دینی انحطاط کے اس دور میں تعمیری اور اصلاحی ادب کا کوئی رسالہ نکالنا اور اسے جاری رکھنا بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ ماہنامہ "افکارِ نو" کے اربابِ بست و کشاد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان حوصلہ شکن حالات میں یہ جرأت کی ہے۔ فاضل مدیر نے علمی مقالات، معلوماتی مضامین، نظموں اور غزلوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ صحتمند اور تعمیری ادب کا ایک حسین گلدستہ بن گیا ہے۔ آخر میں بچوں کی دلچسپی کے لیے ایک بزمِ اطفال بھی سجائی گئی ہے۔ اس قسم کے اصلاحی پرچوں کی سرپرستی کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

ضروری اعلان

دفتر ترجمان القرآن میں پچھلے سالوں کے چند پرچے برائے فروخت موجود ہیں متمنّد حضرات کی سہولت کے لیے ان کی قیمت میں پچاس فیصد رعایت کر دی گئی ہے تعلق رکھنے کے خواہشمند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔

۱- جون سنہ ۴۸ء	جلد ۳۱	عدد ۲	۱۶- نومبر سنہ ۵۰ء	جلد ۳۵	عدد ۱
۲- جولائی سنہ ۴۸ء	" "	" ۳	۱۷- دسمبر سنہ ۵۰ء	" "	" ۲
۳- اگست سنہ ۴۸ء	" "	" ۴	۱۸- مارچ-اپریل سنہ ۵۱ء	" "	" ۵-۶-۱
۴- ستمبر سنہ ۴۸ء	" "	" ۵	۱۹- ستمبر "	" ۳۶	" ۵-۶
۵- جون و جولائی سنہ ۴۹ء	جلد ۳۲	" ۱، ۲	۲۰- اکتوبر "	" ۳۷	" ۱
۶- اگست سنہ ۴۹ء	" "	" ۳	۲۱- نومبر "	" "	" ۲
۷- ستمبر سنہ ۴۹ء	" "	" ۴	۲۲- اپریل و مئی سنہ ۵۲ء	" ۳۸	" ۱-۲
۸- نومبر سنہ ۴۹ء	" "	" ۶	۲۳- جولائی-اگست سنہ ۵۳ء	" ۴۰	" ۴-۵
۹- دسمبر جنوری سنہ ۵۰-۴۹ء	جلد ۳۳	عدد ۱، ۲، ۳	۲۴- ستمبر "	" "	" ۶
۱۰- مارچ سنہ ۵۰ء	" "	" ۴	۲۵- اکتوبر "	" ۴۱	" ۱
۱۱- اپریل سنہ ۵۰ء	" "	" ۵	۲۶- نومبر "	" "	" ۲
۱۲- مئی "	" "	" ۶	۲۷- دسمبر "	" "	" ۳
۱۳- جون "	جلد ۳۴	" ۱	۲۸- مارچ سنہ ۵۴ء	" ۴۱	" ۶
۱۴- جولائی تا ستمبر سنہ ۵۰ء	" "	۲، ۳، ۴، ۵	۲۹- اپریل "	" ۴۲	" ۱
۱۵- اکتوبر سنہ ۵۰ء	" "	" ۶	۳۰- جولائی "	" "	" ۴

۳۱- اگست ۵۴ء	جلد	۴۲	عدد	۵
۳۲- ستمبر ؍	؍	؍	؍	۶
۳۳- مارچ ۵۵ء	؍	۴۳	؍	۶
۳۴- اپریل ؍	؍	۴۴	؍	۱
۳۵- مئی ؍	؍	؍	؍	۲-۳
۳۶- جون ؍	؍	؍	؍	۴
۳۷- جولائی ؍	؍	؍	؍	۵
۳۸- اگست ؍	؍	؍	؍	۶
۳۹- ستمبر ؍	؍	۴۵	؍	۱
۴۰- اکتوبر ؍	؍	؍	؍	۲
۴۱- جنوری ۵۶ء	؍	؍	؍	۵
۴۲- فروری ؍	؍	؍	؍	۶
۴۳- اپریل ؍	؍	۴۶	؍	۲
۴۴- جون ؍	؍	؍	؍	۴
۴۵- اکتوبر	؍	۴۷	؍	۱-۲
۴۶- دسمبر	؍	؍	؍	۴
۴۷- جنوری ۵۷ء	؍	؍	؍	۵
۴۸- جون ؍	؍	۴۸	؍	۲-۳
۴۹- جولائی ؍	؍	؍	؍	۴
۵۰- اگست ؍	؍	؍	؍	۵
۵۱- ستمبر ؍	؍	؍	؍	۶
۵۲- اکتوبر و نومبر ۵۷ء	جلد	۴۹	عدد	۱-۲
۵۳- دسمبر ؍	؍	؍	؍	۳
۵۴- فروری ۵۸ء	؍	؍	؍	۵
۵۵- مارچ ؍	؍	؍	؍	۶
۵۶- اپریل ؍	؍	۵۰	؍	۱
۵۷- جولائی ؍	؍	؍	؍	۴
۵۸- ستمبر ؍	؍	؍	؍	۶
۵۹- اکتوبر ؍	؍	۵۱	؍	۱
۶۰- نومبر ؍	؍	؍	؍	۲
۶۱- دسمبر ؍	؍	؍	؍	۳
۶۲- جنوری ۵۹ء	؍	؍	؍	۴
۶۳- فروری ؍	؍	؍	؍	۵
۶۴- مارچ ؍	؍	؍	؍	۶
۶۵- اپریل ؍	جلد	۵۲	عدد	۱
۶۶- مئی ؍	؍	؍	؍	۲
۶۷- جون ؍	؍	؍	؍	۳
۶۸- جولائی ؍	؍	؍	؍	۴
۶۹- اگست ؍	؍	؍	؍	۵
۷۰- ستمبر ؍	؍	؍	؍	۶
۷۱- اکتوبر ؍	؍	۵۳	؍	۱
۷۲- نومبر ؍	؍	؍	؍	۲

۷۳-	دسمبر ۵۹ء	جلد ۵۳	عدد ۳
۷۴-	جنوری ۶۰ء	"	"	۴
۷۵-	فروری "	"	"	۵
۷۶-	مارچ "	"	"	۶
۷۷-	اپریل "	" ۵۴	"	۱
۷۸-	مئی "	"	"	۲
۷۹-	جون "	"	"	۳
۸۰-	اگست "	"	"	۵
۸۱-	ستمبر "	"	"	۶
۸۲-	اکتوبر "	" ۵۵	"	۱
۸۳-	دسمبر "	"	"	۳
۸۴-	جنوری ۶۱ء	جلد ۵۵	عدد ۴
۸۵-	فروری ۶۱ء	"	"	۵
۸۶-	مارچ "	"	"	۶
۸۷-	اپریل "	جلد ۵۶	عدد ۱

(نوٹ) جلد ۴ ۵ تا جلد ۵ ۵ کی قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے ہوگی۔ ایجنٹوں کے لیے ایجنسی کمیشن کے حساب سے قیمت ادا کرنی ہوگی۔ جلد ۵۴ سے سابقہ پرچوں کی قیمت نصف وصول کی جائے گی۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

منیجر ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

اعلان ۲

دفتر ترجمان القرآن کو حسب ذیل پرچوں کی ضرورت ہے۔ جن ایجنٹوں اور خریداروں کے پاس یہ پرچے برائے فروخت ہوں دفتر کو عام ڈاک سے بھیج دیں۔

(۱) ترجمان القرآن بابت ماہ رجب ۱۳۷۵ھ۔ مطابق۔ مارچ ۱۹۵۶ء

(۲) جون ۱۹۶۰ء (۳) جولائی ۱۹۶۰ء

(۴) نومبر ۱۹۶۰ء۔

اُن پرچوں کی رقم اُس کے حساب سے کم کر دی جائے گی

چراغ الدین منیجر ماہ نامہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ لاہور

اسلام اور جدید معاشی نظریات

از

مولانا سید ابو الا علیٰ مودودی

اس کتاب میں فاضل مصنف نے پہلے دنیا کے موجودہ عمرانی مسائل کی تاریخ کو پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ ان کا شجرۂ نسب کیا ہے اور ان کے حل کی جو صورتیں آج تجویز یا اختیار کی جا رہی ہیں ان کے پیچھے کونسے نظریات اور تصورات کام کر رہے ہیں -

اس کے بعد انہوں نے جدید معاشی نظریات میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے فلسفوں اور عملی نتائج کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک (اسپریلزم، سوشلزم، کمیونزم، فاشزم اور نازی ازم) نے ان مسائل کو حل کہاں تک کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھ انسانی تمدن اور خود انسان کے لئے بیماریاں اور مصائب کیا لایا ہے -

آخر میں اس لمبی تاریخ سے حاصل شدہ سبق کو بیان کر کے فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اصل مرض کیا اور کہاں ہے اور اسلام اس کا کیا علاج پیش کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب موجودہ دور کی معاشی پیچیدگیوں کے حل کے سلسلہ میں روشنی کا مینار ہے -

نفیس طباعت خوبصورت جلد معہ دیدہ زیب گرد پوش

قیمت : سوا دو روپے

منصورہ ○ لاہور، پاکستان

اسلامک پبلی کیشنز لیمیٹڈ کی نئی پیشکش

— سود —

از

مولانا سید ابوالا علی مودودی

نہایت اہم مباحث کے اضافے اور مکمل نظر ثانی کے بعد

پہلی مرتبہ

* نو ابواب * تین ضمیمے * ۴۱۰ صفحات

قسم اعلیٰ مجلد مع آرٹ پیپر کا دیدہ زیب گرد پوش : ساڑھے پانچ روپے

سستا ایڈیشن جلد بکس بورڈ مزین : سوا تین روپے

چند اہم مباحث :—

★ اسلام، سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت کا اصولی فرق ۔

★ حرمت سود : (۱) سلبی پہلو (۲) ایجابی پہلو ۔

★ جدید بینکنگ ۔

★ سود کے متعلق اسلامی احکام ۔

★ کیا تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے ؟

ایڈیٹر جنرل حکومت پاکستان اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے درمیان قلمی مباحثہ ۔

★ سود کے متعلق آٹھ اہم سوالات پر — علماء اسلام اور ملک کے ماہرین اقتصادیات کے درمیان مباحثہ ۔

اسلامک پبلی کیشنز لیمیٹڈ

۱۱- سی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور